مبادیاتِ تفسیر

جلد ۱



حضرت مولانا نعیم الدّین صاحب مدظلّہم

اُستاذ الحدیث جامعہ مدنیّہ کریم پارک

مُدیر صُفّہ ٹرسٹ موہنی روڈ لاہور

صُفّہ ٹرسٹ لاہور

مبادیاتِ تفسیر

حضرت مولانا نعیم الدین صاحب مدظلہم
اُستاذ الحدیث جامعہ مدنیہ کریم پارک
و مُدیر صُفّہ ٹرسٹ موہنی روڈ لاہور



صُفّہ ٹرسٹ لاہور
محمود سٹریٹ ○ موھنی روڈ ○ لاھور
PH:37 11 24 92

سلسلۂ اشاعت نمبر 31

نام کتاب:............ مبادیاتِ تفسیر

تصنیف: .... حضرت مولانا نعیم الدین صاحب مدظلہم

طبع اوّل :............ یکم رجمادی الثانیہ ۱۴۳۶ھ/۲۲رمارچ ۲۰۱۵ء بروز اتوار

باہتمام: .... صفہ ٹرسٹ ۳رمحمود سٹریٹ، موہنی روڈ، لاہور

☆ ملنے کے پتے ☆

مکتبہ قاسمیہ ۱۷رالفضل مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

مکتبہ سلطانِ عالمگیرؒ، ۵رلوئر مال، اُردو بازار، لاہور

ناشرانِ خادران، ۳رمحمود سٹریٹ موہنی روڈ، لاہور

مکتبہ رشیدیہ، نزد مقدس مسجد، اُردو بازار، کراچی


بسم اللہ الرحمن الرحیم

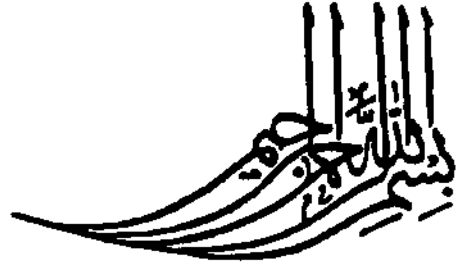
فہرست



مدرسہ جامعہ مدنیہ میں ناچیز کو ہر سال جو اسباق تدریس کے لیے ملتے ہیں اُن میں ایک سبق تفسیرِ جلالین کا بھی ہوتا ہے۔ احقر نے جب جلالین شریف پڑھانی شروع کی تھی اس وقت مبادیات کے طور پر کچھ نوٹس تیار کیے تھے جو احقر جلالین کے طلباء کو سبق شروع کرانے سے پہلے پڑھا دیا کرتا تھا، اس سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ طلباءِ کرام جہاں فنِ تفسیر کی ضروری باتوں سے واقف ہوتے تھے وہیں جلالین شریف اور اس کے مصنفین کے حالات سے بھی واقف ہو جاتے تھے، یہی نوٹس احقر نے بعض مقامات پر دورہ تفسیر کے طلباء کو بھی پڑھائے جس سے اُنہیں بھی فائدہ محسوس ہوا، ابتداءً چونکہ یہ نوٹس مختصر تھے اِس لیے ناچیز اِن کے فوٹو اسٹیٹ کروا کر طلباء کو دے دیتا تھا، بعد میں اللہ کی توفیق سے اِن میں سال بہ سال اضافہ ہوتا رہا جس سے یہ ایک اچھی خاصی کتاب کی شکل اختیار کر گئے، میرے بہت سے مخلصین و محبین کا تقاضا ہوا کہ انہیں کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے، تاکہ ان کا فائدہ عام ہو جائے، چنانچہ ناچیز نے اللہ کی توفیق و مدد سے اِن پر نظر ثانی اور ترمیم و اضافہ کر کے انہیں کتابی شکل دے دی اور ان کا نام "مبادیاتِ تفسیر" طے کر دیا۔ اب یہ نوٹس "مبادیاتِ تفسیر" کے نام سے شائع کیے جا رہے ہیں۔ ناسپاسی ہو گی اگر اس موقع پر اپنے محبِ مخلص عزیز القدر سید لبیق ساجد بخاری سلّمہ اللہ الباری کا شکریہ ادا نہ کیا جائے کہ انہوں نے انتہائی محنت و محبت کے ساتھ اس کی

کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کا کام کیا جس سے یہ کتاب شائع ہونے کے قابل ہوئی۔
اللہ تعالیٰ انہیں اس کی اپنی شایانِ شایان جزائے خیر عطاء فرمائے۔
راقم الحروف کو اپنی کم مائیگی کا بھرپور اعتراف ہے اس لیے قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اگر اس کتاب میں کسی مقام پر کوئی غلطی یا کسی قسم کا کوئی سقم پائیں تو احقر کو ضرور مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں اس کی ضرور اصلاح کی جاسکے۔
آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ناچیز کی اِس حقیر سی کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرماکر عوام الناس کے لیے ذریعہ علم و آگہی اور ناچیز کے لیے ذریعہ نجات بنائے۔
آمین بحرمة سید المرسلین وآله واصحابه أجمعین

احقر نعیم الدین
۶ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ



کسی بھی علم کو شروع کرنے سے پہلے چند چیزوں کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔

۱۔ علم کی تعریف ۲۔ علم کا موضوع ۳۔ علم کی غرض وغایت ۴۔ علم کا واضع ۵۔ علم کا مرتبہ ومقام

ہم چونکہ علمِ تفسیر شروع کر رہے ہیں اس لیے سب سے پہلے تفسیر کے لغوی اور اصطلاحی معنیٰ ذکر کیے جاتے ہیں۔

تفسیر کی لغوی تحقیق:

فَسَرَ (ن ض) فَسْرًا الْأَمْرَ واضح کرنا، ظاہر کرنا۔ المغطّٰی ڈھکے ہوئے کو کھولنا۔

فَسَرَ (ن ض) فَسْرًا وَ تَفْسِرَةً الطَّبِيْبُ، طبیب کا قارورہ دیکھنا۔ فَسَّرَهٗ تَفْسِيْرًا (تفعیل) واضح کرنا، ظاہر کرنا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ لفظ تفسیر فَسْرٌ سے نکلا ہے جس کے معنیٰ ہیں واضح کرنا اور کھولنا۔ اس علم میں بھی چونکہ قرآن کریم کے مفہوم کو کھول کر بیان کیا جاتا ہے اس لیے اِسے علمِ تفسیر کہتے ہیں۔

تفسیر کی اصطلاحی تعریف:

علمِ تفسیر چونکہ ایک وسیع علم ہے اِس لیے اِس کی تعریف مفسرین اپنے اپنے ذوق کے مطابق کرتے رہے ہیں۔

(۱) علامہ سعد الدین تفتازانی حنفی رحمہ اللہ (م: ۷۹۲ھ) فرماتے ہیں:

"هُوَ الْعِلْمُ الْبَاحِثُ عَنْ أُصُوْلِ كَلَامِ اللهِ تَعَالٰى مِنْ حَيْثُ الدَّلَالَةِ عَلَى الْمُرَادِ"

علمِ تفسیر وہ علم ہے جو کلام اللہ کے اصول سے بحث کرتا ہے اس حیثیت سے کہ اُن کی مراد و مقصود پر دلالت ہو۔

(۲) علامہ برہان الدین زرکشیؒ (م: ۷۹۴ھ) فرماتے ہیں:

"عِلْمٌ يُفْهَمُ بِهٖ كِتَابُ اللهِ الْمُنَزَّلُ عَلٰى نَبِيِّهٖ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ بَيَانُ مَعَانِيْهِ وَاسْتِخْرَاجُ أَحْكَامِهٖ وَحِكَمِهٖ"(۱)

علمِ تفسیر وہ علم ہے جس سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب یعنی قرآن کریم کا فہم حاصل ہو اور اس کے معانی کی وضاحت اور اس کے احکام اور حکمتوں کا استنباط کیا جاسکے۔

(۳) علامہ ابوحیّان اندلسی الظاہری (م: ۷۹۴ھ) فرماتے ہیں:

" اَلتَّفْسِيْرُ عِلْمٌ يُبْحَثُ فِيْهِ عَنْ كَيْفِيَّةِ النُّطْقِ بِأَلْفَاظِ الْقُرْآنِ وَ مَدْلُوْلَاتِهَا وَ أَحْكَامِهَا الْإِفْرَادِيَّةِ وَالتَّرْكِيْبِيَّةِ وَمَعَانِيْهَا الَّتِيْ تُحْمَلُ عَلَيْهَا حَالَةَ التَّرْكِيْبِ وَتَتِمَّاتُ

(۱) الاتقان في علوم القرآن، ج۲ ص ۱۷۴

لِذٰلِکَ"۔[1]

علم تفسیر وہ علم ہے جس میں (ایک تو) الفاظِ قرآن کی ادائیگی کے طریقے، ان کے مفہوم، ان کے اِفرادی اور ترکیبی احکام سے بحث کی جاتی ہے (اور دوسرے) ان معانی سے بحث کی جاتی ہے جو اُن الفاظ سے ترکیبی حالت میں مراد لیے جاتے ہیں۔ نیز ان معانی کا تکملہ (ناسخ و منسوخ، شانِ نزول اور مبہم قِصّوں کی توضیح کی شکل میں) بیان کیا جاتا ہے۔

اس تعریف کی روشنی میں علم تفسیر مندرجہ ذیل اجزاء پر مشتمل ہے،

(۱) "الفاظِ قرآن کی ادائیگی کے طریقے" یعنی الفاظِ قرآن کو کس کس طریقے سے پڑھا جاسکتا ہے۔ اِس مقصد کے لیے ایک مستقل علم قراءات کے نام سے موجود ہے۔

(۲) "الفاظِ قرآنی کے مفہوم" یعنی اُن کے لغوی معنٰی۔ اس کے لیے علمِ لغت سے پوری طرح باخبر ہونا ضروری ہے۔

(۳) "الفاظ کے انفرادی احکام" یعنی ہر لفظ کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ اس کا مادّہ کیا ہے، یہ موجودہ صورت میں کس طرح آیا ہے، اس کا وزن کیا ہے، اِس وزن کے معانی وخواص کیا ہیں۔ ان باتوں کے لیے علمِ صرف کی ضرورت پڑتی ہے۔

(۴) "الفاظ کے ترکیبی احکام" یعنی ہر لفظ کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ وہ دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر کیا معنٰی دے رہا ہے، اس کی نحوی ترکیب کیا ہے، اس پر موجودہ حرکات کیوں آئی ہیں اور کن معانی پر دلالت کر رہی ہیں۔ اس کام کے لیے علمِ نحو اور علمِ معانی سے مدد لی جاتی ہے۔

---

(۱) البحر المحيط في علم التفسير ج ۱، ص ۱۳

(۵) "ترکیبی حالت میں الفاظ کے مجموعی معنٰی" یعنی پوری آیت اپنے سیاق وسباق میں کیا معنٰی دے رہی ہے۔ اس مقصد کے لیے آیت کے مضامین کے لحاظ سے مختلف علوم سے مدد لی جاتی ہے۔

(۶) "معانی کے تکملے" یعنی آیاتِ قرآنی کا پس منظر اور جو بات قرآن میں مجمل ہے اس کی تفصیل۔ اِس غرض کے لیے زیادہ تر علمِ حدیث سے کام لیا جاتا ہے۔[1]

۴ علامہ احمد بن مصطفیٰ مشہور بہ طاش کبریٰ زادہ حنفیؒ (م:۹۶۸ھ) فرماتے ہیں:

"هُوَ عِلْمٌ بَاحِثٌ عَنْ مَعْنٰى نَظْمِ الْقُرْآنِ بِحَسْبِ الطَّاقَةِ الْبَشَرِيَّةِ وَبِحَسْبِ مَا يَقْتَضِيْهِ الْقَوَاعِدُ الْعَرَبِيَّةُ"[2]

علمِ تفسیر وہ علم ہے جو الفاظِ قرآنی کے معنٰی سے انسانی طاقت اور قواعدِ عربیہ کے مقتضٰی کے مطابق بحث کرتا ہے۔

تفسیر اور تاویل:

قدیم زمانے میں تفسیر کے لیے ایک اور لفظ استعمال ہوتا تھا یعنی "تَأْوِیْل" خود قرآن کریم نے بھی اپنی تفسیر کے لیے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ۔ اِس لیے بعد کے علماء میں یہ بحث چھڑ گئی کہ آیا تفسیر اور تاویل دونوں ایک ہی مفہوم ومدعیٰ کی دو تعبیریں ہیں یا اِن دونوں میں فرق ہے؟ اور اگر فرق ہے تو کیا ہے؟ اِس سلسلہ میں علماءِ مفسرین میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔

امام ابو عبیدؒ اور ان کے ہم خیال علماء کی رائے ہے کہ یہ دونوں مترادف ہیں اور اِن میں کوئی فرق نہیں ہے، اِن کے برخلاف ابن حبیب نیشاپوریؒ، امام راغب اصفہانیؒ

---

(۱) علوم القرآن، ص ۳۲۲، از حضرت مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

(۲) مفتاح السعادۃ، ج ۲، ص ۵۴

(م:۵۰۳ھ) علامہ ابونصر قشیریؒ وغیرھم جیسے ائمہ فن کا کہنا ہے کہ اِن دونوں میں فرق ہے، پھر یہ حضرات اپنے اپنے ذوق کے مطابق فرق کرتے ہیں۔

(۱) امام راغب اصفہانیؒ کا کہنا ہے کہ

"تفسیر بنسبت تاویل کے عام ہے، تفسیر کا استعمال زیادہ تر الفاظ اور مفردات میں ہوتا ہے اور تاویل کا استعمال معانی اور جملوں میں ہوتا ہے، نیز تاویل کا استعمال زیادہ تر کتبِ الٰہیہ کے بارے میں ہوتا ہے اور تفسیر کو کتبِ سَمَاوِیہ اور اِن کے علاوہ دیگر کتب میں بھی استعمال کر لیتے ہیں"(۱)۔

(۲) امام ابو منصور ماتریدیؒ فرماتے ہیں کہ

"تفسیر اِس قطع و یقین کا نام ہے کہ لفظ سے حق تعالیٰ کی مراد یہی اَمر ہے اور تاویل اِس کو کہتے ہیں کہ بہت سے احتمالات میں سے کسی ایک کو یقین کے بغیر ترجیح دے دی جائے"(۲)۔

(۳) امام ابوطالب ثعلبیؒ فرماتے ہیں کہ

"تفسیر لفظ کی وضع کو بیان کرنے کا نام ہے حقیقۃً ہو یا مجازاً، جیسے اَلصِّرَاطُ کی تفسیر اَلطَّرِیْقُ کے ساتھ، اور اَلصَّیِّبُ کی تفسیر اَلْمَطَرُ کے ساتھ، اور تاویل لفظ کے اندرونی مدعٰی کی تعبیر کا نام ہے، جیسے آیت إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ کی تفسیر یہ ہے کہ مِرْصَادْ رَصْدٌ سے ماخوذ ہے یُقَالُ رَصَدْتُهٗ میں نے اس کی نگرانی کی اور تاک رکھی، مِرْصَادُ اسی سے مصدرِ میمی ہے، اور اِس کی تاویل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اِس سے اپنے

---

(۱) روح المعانی۔ج۱، ص ۴۔۔۔ الاتقان فی علوم القرآن۔ج۲، ص ۱۷۳

(۲) روح المعانی۔ج۱، ص ۴۔۔۔ الاتقان فی علوم القرآن۔ج۲، ص ۱۷۳

حکم کی بجاآوری میں سستی کرنے اور غفلت برتنے کے بُرے انجام سے
ڈرایا ہے"(۱)

اِس کو مختصر الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تفسیر الفاظ کے ظاہری معنٰی بیان کرنے کو کہتے ہیں اور تاویل اصل مراد کی توضیح کو۔

(۴) امام بونصر قشیریؒ فرماتے ہیں کہ

"تفسیر کا انحصار سماع و پیروی پر ہے اور تاویل کا تعلق احکام کے استنباط واستخراج سے ہے"۔(۲)

(۵) "تفسیر ایسے لفظ کے بیان (واضح کرنے) کا نام ہے جو صرف ایک ہی پہلو کا حامل ہو اور تاویل مختلف معانی کے حامل لفظ کو اس کے کسی ایک معنٰی کی طرف لوٹانے کا نام ہے"۔(۳)

(۶) "تفسیر کا تعلق روایت سے ہے اور تاویل کا تعلق درایت سے ہے"۔(۴)

(۷) علامہ سلیمان الجملؒ (م:۱۲۰۴ھ) تحریر فرماتے ہیں:

"الفرق بين التفسير والتأويل أن التفسير تعيين معنى اللفظ بواسطة نقل من قرآنٍ أو سنّةٍ أو أثرٍ أو بواسطة التخريج على القواعد الأدبية و أن التأويل حمل اللفظ المحتمل لمعانٍ على بعضها بواسطة القواعد العقلية الصحيحة"(۵)

---

(۱) الاتقان۔ج۲، ص۱۷۳

(۲) الاتقان۔ج۲، ص۱۷۳

(۳) الاتقان۔ج۲، ص۱۷۳

(۴) روح المعانی۔ج۱، ص۴ ـــــ الاتقان۔ج۲، ص۱۷۳

(۵) حاشیة الجمل۔ج۱، ص۶

تفسیر اور تاویل کے درمیان فرق یہ ہے کہ تفسیر کہتے ہیں لفظ کے معنی متعین کرنے کو، کتاب اللہ کے ذریعہ یا سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یا آثارِ صحابہ کے ذریعہ یا اَدَبی قواعد پر تخریج کے ذریعہ، اور تاویل کہتے ہیں مختلفُ المعنیٰ لفظ کے کسی ایک معنیٰ پر محمول کرنے کو قواعدِ عقلیہ صحیحہ کے ذریعہ۔

تفسیر کے لیے پندرہ علوم ناگزیر ہیں:

تفسیر قرآن کے کے لیے اہلیت شرط ہے۔ نااہل کے لیے قرآن کی تفسیر کرنا جائز نہیں، اور تفسیر کی اہلیت پیدا کرنے کے لیے پندرہ علوم پر مہارت ناگزیر ہے۔

چنانچہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ (م:۱۴۰۲ھ ۱۹۸۲ء) تحریر فرماتے ہیں:

"اہلِ فن نے تفسیر کے لیے پندرہ علوم پر مہارت ضروری بتلائی ہے (۱) لغت (۲) نحو (۳) صرف (۴) اشتقاق (۵) علم معانی (۶) علم بیان (۷) علم بدیع (۸) علم قراءات (۹) علم عقائد (۱۰) اصولِ فقہ (۱۱) اسبابِ نزول (۱۲) ناسخ و منسوخ (۱۳) علم فقہ (۱۴) ان احادیث کا جاننا جو قرآن پاک کی مجمل آیات کی تفسیر واقع ہوئی ہیں (۱۵) وہ علم وہبی جو حق سبحانہٗ وتقدّس کا عطیہ خاص ہے"۔(۱)

یہ بات حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے اپنے پاس سے نہیں کی علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب "الاتقان في علوم القرآن" ج ۲ ص ۱۸۰ پر بعینہ یہی بات موجود ہے۔

---

(۱) فضائل قرآن۔ ص ۱۹، مشمولہ فضائل اعمال مکتبہ مدنیہ لاہور

تفسیرِ قرآن کے ماخذ:

تفسیرِ قرآن کے ماخذ دو قسم کے ہیں، (۱) قابلِ اعتبار (۲) نا قابلِ اعتبار

قابلِ اعتبار ماخذ چھ ہیں (۱) قرآن کریم (۲) احادیث مبارکہ (۳) اقوالِ صحابہؓ (۴) اقوالِ تابعین (۵) لغتِ عرب (۶) عقلِ سلیم۔

نا قابلِ اعتبار ماخذ تین ہیں (۱) اسرائیلی روایات (۲) صوفیاءِ کرام کی تفسیریں (۳) تفسیر بالرائے

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے اِن ماخذ کی مکمل تشریح اپنی کتاب "علوم القرآن" میں ذکر کی ہے۔

یہاں صرف نا قابلِ اعتبار ماخذ کی تشریح کا خلاصہ ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) اسرائیلی روایات:

"اسرائیلیات" یا "اسرائیلی روایات" اُن روایات کو کہتے ہیں جو یہودیوں، یا عیسائیوں سے ہم تک پہنچی ہیں، ان میں سے بعض براہِ راست بائبل یا تالمود سے لی گئی ہیں، بعض مشنا اور ان کی شروح سے، اور بعض وہ زبانی روایات ہیں جو اہلِ کتاب میں سینہ بسینہ نقل ہوتی چلی آئی ہیں، اور عرب کے یہود و نصارٰی میں معروف و مشہور تھیں، تفسیر کی مروّجہ کتابوں میں ایسی روایات کی ایک بھاری تعداد موجود ہے، ان روایات کا حکم بیان کرتے ہوئے مشہور محقق صاحبِ تفسیر حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ایسی روایات کی تین قسمیں ہیں، اور ہر قسم کا حکم علیحدہ ہے:

ا۔ پہلی قسم وہ اسرائیلیات ہیں جن کی تصدیق دوسرے خارجی دلائل سے ہو چکی ہے مثلاً فرعون کا غرق ہو جانا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں سے مقابلہ، آپ کا کوہِ طور پر جانا وغیرہ، ایسی روایات اس لیے قابلِ اعتبار ہیں کہ قرآن کریم یا صحیح احادیث نے اُن کی تصدیق کر دی ہے۔

(۲) دوسری قسم وہ اسرائیلیات ہیں جن کا جھوٹا ہونا خارجی دلائل سے ثابت ہوچکا ہے، مثلاً یہ کہانی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام آخر عمر میں (معاذاللہ) بت پرستی میں مبتلا ہوگئے تھے[1]۔ یہ روایت اس لیے قطعاً باطل ہے کہ قرآن کریم نے صراحۃً اس کی تردید فرمائی ہے، اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں یہ من گھڑت کہانی کہ آپ (معاذاللہ) اپنے سپہ سالار اوریا کی بیوی پر فریفتہ ہوگئے تھے[2]۔

(۳) تیسری قسم اُن اسرائیلیات کی ہے جن کے بارے میں خارجی دلائل سے نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ سچی ہیں اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ جھوٹی ہیں، مثلاً تورات کے احکام وغیرہ ایسی اسرائیلیات کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے:۔

لَاتُصَدِّقُوهَا وَلَاتُكَذِّبُوهَا

"نہ اُن کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب"

اس قسم کی روایات کو بیان کرنا تو جائز ہے لیکن نہ اُن پر کسی دینی مسئلہ کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے اور نہ اُن کی تصدیق یا تکذیب کی جاسکتی ہے، اور اس قسم کی روایات بیان کرنے کا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ[3] فرماتے ہیں کہ خود قرآن کریم نے سورۃ کہف میں یہ تعلیم دی ہے کہ اس قسم کی روایات کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے؟ ارشاد ہے:۔

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ قُل رَّبِّي

---

(۱) بائبل، کتاب سلاطین اول ۱۱: ۲ تا ۱۳

(۲) ایضاً ۲۔ سموئیل ۱۳: ۱۴

(۳) تفسیر ابن کثیر۔ مقدمہ ج ۱، ص ۴۔ اصول التفسیر لابن تیمیہؒ ص ۴۳

أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ مِنْهُمْ أَحَدًا

"(اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں بعض اہلِ کتاب) کہیں گے کہ وہ تین ہیں اور چوتھا اُن کا کتا ہے، اور بعض کہیں گے کہ پانچ ہیں، چھٹا اُن کا کتا ہے، یہ لوگ اٹکل پچّوں ہانک رہے ہیں، اور بعض کہیں گے کہ وہ سات ہیں اور آٹھواں اُن کا کتا ہے، آپؐ کہہ دیجیے کہ میرا رب اُن کی تعداد خوب جانتا ہے، اُن کو بہت کم لوگ جانتے ہیں، سو آپؐ اُن کے بارے میں بجز سرسری بحث کے زیادہ بحث نہ کیجیے، اور آپؐ اُن کے بارے میں اُن لوگوں میں سے کسی سے بھی نہ پوچھیے۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کی تعداد کے بارے میں اہلِ کتاب کی مختلف اسرائیلی روایات بیان فرمائی ہیں، اور ساتھ ہی مندرجہ ذیل باتوں کی طرف اشارہ فرمادیا ہے:۔

۱۔ اسرائیلی روایات اور ان کا اختلاف بیان کرنا جائز ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا۔

۲۔ ان میں سے جو روایتیں غلط ثابت ہو چکی ہوں اُن کے غلط ہونے پر تنبیہ بھی کر دینی چاہیے، جیسا کہ پہلے دو اقوال کو اللہ تعالیٰ نے "رَجْماً بِالْغَيْبِ" کہہ کر رد فرمایا ہے۔

۳۔ جس روایت کی غلطی پر کوئی دلیل نہ ہو، اس کے بارے میں سکوت اختیار کرنا چاہیے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے تیسری روایت پر سکوت اختیار فرمایا۔

۴۔ ان روایات کے صدق و کذب کے بارے میں یہ ایمان رکھنا چاہیے کہ حقیقی علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

۵۔ ان روایات کے بارے میں زیادہ بحث و مباحثہ سے پرہیز کرنا چاہیے۔

۶۔ ایسی روایات کی زیادہ تحقیق و تفتیش میں پڑنا بھی درست نہیں، کیونکہ ان سے دنیا و آخرت کا کوئی قابلِ ذکر فائدہ متعلق نہیں۔

پھر بعض روایات میں تو صراحت ہوتی ہے کہ یہ اسرائیلی روایت ہے اور بعض روایات میں ایسی صراحت نہیں ہوتی لیکن دوسرے دلائل کی روشنی میں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اسرائیلیات میں سے ہے، تفسیر کی کتابوں میں جو روایات کعب الاحبار اور وہب بن منبّہ سے مروی ہیں وہ زیادہ تر اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں"۔[1]

(۲) صوفیاء کرامؒ کی تفسیریں:

صوفیائے کرامؒ سے قرآن کریم کی آیات کے تحت کچھ ایسی باتیں منقول ہیں جو بظاہر تفسیر معلوم ہوتی ہیں، مگر وہ آیت کے ظاہری اور ماثور معنی کے خلاف معلوم ہوتی ہیں، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ

"قتال کرو ان کافروں سے جو تم سے متصل ہیں"

اس کے تحت بعض صوفیاء نے کہا کہ:۔

قَاتِلُوا النَّفْسَ فَإِنَّهَا تَلِي الْإِنْسَانَ

"نفس سے قتال کرو کیونکہ وہ انسان سے سب سے زیادہ متصل ہے"

اس قسم کے جملوں کو بعض حضرات نے قرآن کریم کی تفسیر سمجھ لیا، حالانکہ درحقیقت یہ تفسیر نہیں، صوفیاء کرام کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ قرآن کریم کی اصل مراد یہ ہے اور جو مفہوم ظاہری الفاظ سے سمجھ میں آرہا ہے وہ مراد نہیں

---

(۱) علوم القرآن ص ۳۴۵ تا ۳۴۸

ہے، بلکہ وہ قرآن کریم کے ظاہری مفہوم پر جو اس کے اصل ماخذ سے ثابت ہو پوری طرح ایمان رکھتے ہیں اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی تفسیر وہی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اُن وجدانی استنباطات کو بھی ذکر کر دیتے ہیں جو اُس آیت کی تلاوت کے وقت اُن کے قلب پر وارد ہوئے، چنانچہ مذکورہ بالا مثال میں صوفیاء کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس آیت میں کفار کے مقابلے پر جہاد و قتال کا حکم مراد نہیں، بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ کفار سے جہاد و قتال کا حکم تو اس آیت کا اصلی تقاضا ہے ہی، لیکن اس آیت سے وجدانی طور پر انسان کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ سب سے قریبی نافرمان اس کا نفس ہے جو اسے برائیوں پر آمادہ کرتا رہتا ہے، لہٰذا کفار سے جہاد کے ساتھ ساتھ اس سے بھی جہاد ضروری ہے۔

ماضی قریب کے معروف مفسّر علامہ محمود آلوسیؒ، جن کی تفسیر میں صوفیاء کرام کے اس قسم کے وجدانی استنباطات بکثرت ملتے ہیں، صوفیاء کے منشاء کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"قرآن کریم میں ساداتِ صوفیاء سے جو کلام منقول ہے وہ در حقیقت ان دقیق امور کی طرف اشارے ہوتے ہیں جو اربابِ سلوک پر منکشف ہوتے ہیں اور ان اشارات میں اور قرآن کریم کے ظاہری مفہوم میں جو حقیقتاً مراد ہوتا ہے تطبیق ممکن ہے، صوفیاء کا یہ اعتقاد نہیں ہوتا کہ ظاہری مفہوم مراد نہیں، اور باطنی مفہوم مراد ہے، اس لیے کہ یہ تو باطنی ملحدوں کا اعتقاد ہے جسے انہوں نے شریعت کی بالکلیّہ نفی کا زینہ بنایا ہے، ہمارے صوفیاءِ کرام کا اس اعتقاد سے کوئی واسطہ نہیں اور ہو بھی کیسے سکتا ہے، جبکہ صوفیاء نے یہ تاکید کی ہے کہ قرآن کریم کی ظاہری تفسیر کو سب سے پہلے حاصل

کیا جائے"۔(۱)

لیکن صوفیاء کے اس قسم کے اقوال کے بارے میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:۔

۱۔ ان اقوال کو قرآن کریم کی تفسیر قرار نہ دیا جائے، بلکہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ قرآن کریم کی اصل مراد وہی ہے جو تفسیر کے اصل ماخذ سے سمجھ میں آتی ہے اور یہ اقوال محض وجدانی استنباط کی حیثیت رکھتے ہیں، لہٰذا اگر ان اقوال کو قرآن کریم کی تفسیر سمجھ لیا جائے تو یہ گمراہی ہے، چنانچہ امام ابو عبدالرحمٰن سلمیؒ نے ایک کتاب حقائق التفسیر کے نام سے لکھی تھی جو اسی قسم کے اقوال پر مشتمل تھی، اس کے بارے میں امام واحدیؒ نے فرمایا کہ:۔

"جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ یہ تفسیر ہے وہ کافر ہو جائے گا"(۲)

۲۔ اس قسم کے اقوال میں بھی صرف ان اقوال کو درست سمجھا جا سکتا ہے جن سے قرآن کریم کی کسی آیت کے ظاہری مفہوم یا شریعت کے کسی مسلمہ اصول کی نفی نہ ہوتی ہو، اور اگر ان وجدانیات کے پردے میں دین کے مسلّم اصول و قواعد کی خلاف ورزی کی جانے لگے تو یہ صریح الحاد ہے۔

۳۔ اس قسم کے وجدانیات صرف اس وقت معتبر ہو سکتے ہیں جب وہ قرآن کریم کی تحریف کی حد تک نہ پہنچتے ہوں، اور اگر قرآن کریم کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر کوئی بات کہی جائے تو وہ بھی الحاد اور گمراہی ہے، مثلاً ایک شخص نے آیت قرآنی "مَنْ ذَاالَّذِيْ يَشْفَعُ" کے تحت یہ کہا کہ یہ اصل میں

---

(۱) روح المعانی۔ ج ۱، ص ۷، مقدمہ۔ فائدہ ثانیہ، یہی مضمون علامہ سیوطیؒ نے شیخ تاج الدین بن عطاء اللہؒ سے نقل فرمایا ہے، (الاتقان۔ ج ۲، ص ۱۸۵)

(۲) الاتقان۔ ج ۲، ص ۱۸۴

"مَنْ ذَلَّ ذِيْ يَشْفَ عْ" ہے، ذِيْ سے مراد "نفس" ہے، اور مطلب یہ ہے کہ "جو شخص نفس کو ذلیل کرے گا، شفا پاجائے گا، اس بات کو یاد رکھو" علامہ سراج الدین بلقینیؒ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا، تو فرمایا کہ: "ایسا کہنے والا ملحد ہے"۔(۱)

۴۔ قدیم زمانے میں ملحدوں کا ایک فرقہ "باطنیہ" کے نام سے گزرا ہے جس کا دعویٰ یہ تھا کہ قرآن کریم سے ظاہری طور پر جو مطلب سمجھ میں آتا ہے، حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے، بلکہ ہر لفظ سے ایک باطنی مفہوم کی طرف اشارہ ہے، اور وہی قرآن کی اصل تفسیر ہے۔ یہ اعتقاد باجماعِ امت کفر والحاد ہے، لہٰذا صوفیاء کے کسی قول کے بارے میں اس قسم کا اعتقاد رکھا جائے تو وہ باطنیت ہوگا، ان چار امور کی رعایت کے ساتھ صوفیاءِ کرام کے اقوال کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے اور بلاشبہ بعض مخصوص واردات واحوال رکھنے والوں کو ان اقوال سے فائدہ بھی پہنچا ہے، اسی وجہ سے علامہ آلوسیؒ اپنی تفسیر "روح المعانی" میں آیات کی مکمل تفسیر لکھنے کے بعد ایک مستقل عنوان "من باب الاشارۃ فی الآیات" قائم کرتے ہیں اور اس میں اس قسم کے وجدانیات ذکر فرماتے ہیں، مذکورہ بالا گزارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ صوفیاءِ کرام نے قرآن کریم کے تحت اپنے جو وجدانیات ذکر فرمائے ہیں وہ قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہیں، اور بعض لوگوں نے اُن پر باطنیت کا جو الزام عائد کیا ہے وہ درست نہیں، اس کے باوجود ہم حافظ ابن الصلاحؒ کے اس ارشاد کو نقل کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ:۔

---

(۱) الاتقان۔ ج۲، ص ۱۸۴

ومع ذلک فیالیتھم لم یتساھلوا بمثل ذلک لمافیه من الایھام والالباس(۱)

" اس کے باوجود اے کاش! کہ یہ حضرات اس قسم کے اقوال نقل کرنے میں اتنے تساہل سے کام نہ لیتے، کیونکہ ان میں غلط فہمی اور اشتباہ کی بڑی گنجائش ہے"۔

۳۔ تفسیر بالرائے:

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے:۔

مَنْ تَكَلَّمَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهٖ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ

"جو شخص قرآن کریم کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ گفتگو کرے تو اگر صحیح بات بھی کہے تو اس نے غلطی کی"۔

علامہ ماوردیؒ فرماتے ہیں:

"بعض غلوؔ پسند لوگوں نے اس حدیث سے یہ مطلب سمجھا کہ قرآن کریم کے بارے میں کوئی بات فکر ورائے کی بنیاد پر کہنا جائز نہیں، یہاں تک کہ اجتہاد کے ذریعے قرآن کریم سے ایسے معانی بھی مستنبط نہیں کیے جاسکتے جو اصولِ شرعیہ کے مطابق ہوں لیکن یہ خیال درست نہیں کیونکہ خود قرآن کریم نے تدبّر اور استنباط کو جابجا مستحسن قرار دیا ہے اور اگر فکر و تدبّر پر بالکل پابندی لگادی جائے تو قرآن وسنّت سے شرعی احکام وقوانین مستنبط کرنے کا دروازہ ہی سرے سے بند ہوجائے گا لہٰذا اس حدیث کا مطلب ہر قسم کی رائے پر پابندی لگانا نہیں ہے"۔(۲)

چنانچہ اس بات پر جمہور علماء متفق ہیں کہ خود قرآن وسنت کے دوسرے دلائل کی روشنی میں اس حدیث کا منشاء یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرآن کریم کے

---

(۱) الاتقان۔ج۲،ص۱۸۴

(۲) ماخوذ از الاتقان۔ج۲،ص۱۸۰،نوع۷۸

معاملے میں غور و فکر اور عقل و رائے کو بالکل استعمال نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کا اصل منشاء یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر کے لیے جو اصول اجماعی طور پر مسلّم اور طے شدہ ہیں، ان کو نظر انداز کر کے جو تفسیر محض رائے کی بنیاد پر کی جائے گی وہ ناجائز ہوگی، اور اگر اس طرح تفسیر کے معاملے میں دخل دے کر کوئی شخص اتفاقاً کسی صحیح نتیجے پر بھی پہنچ جائے تو وہ خطاکار ہے، کیونکہ اس نے راستہ غلط اختیار کیا، اب اصولِ تفسیر کو نظر انداز کرنے کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں، مثلاً

۱۔ جو شخص تفسیر قرآن کے بارے میں گفتگو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، وہ محض اپنی رائے کے بل بوتے پر تفسیر شروع کردے۔

۲۔ کسی آیت کی کوئی تفسیر صراحۃً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ و تابعینؒ سے ثابت ہو اور وہ اسے نظر انداز کر کے محض اپنی عقل سے کوئی معنی بیان کرنے لگے۔

۳۔ جن آیات میں صحابہؓ و تابعینؒ سے کوئی صریح تفسیر منقول نہیں، ان میں لغت اور زبان و ادب کے اصولوں کو پامال کر کے کوئی تشریح بیان کرے۔

۴۔ قرآن و سنت سے براہ راست احکام و قوانین مستنبط کرنے کے لیے اجتہاد کی اہلیت نہ رکھتا ہو، اور پھر اجتہاد شروع کردے۔

۵۔ قرآن کریم کی متشابہ آیات (جن کے بارے میں قرآن نے خود کہہ دیا ہے کہ ان کی سو فیصد صحیح مراد سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا) ان کی جزم و وثوق کے ساتھ کوئی تفسیر بیان کرے اور اس پر مُصر ہو۔

۶۔ قرآن کریم کی ایسی تفسیر بیان کرے جس سے اسلام کے دوسرے اجماعی طور پر مسلّم اور طے شدہ عقائد یا احکام مجروح ہوتے ہوں۔

۷۔ تفسیر کے معاملے میں جہاں عقل و فکر کا استعمال جائز ہے وہاں کسی قطعی

دلیل کے بغیر اپنی ذاتی رائے کو یقینی طور پر درست اور دوسرے مجتہدین کی آراء کو یقینی طور سے باطل قرار دے۔

یہ تمام صورتیں اس "تفسیر بالرائے" کی ہیں جن سے مذکورہ بالا حدیث میں منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک دوسری حدیث میں ان تمام صورتوں کو اس مختصر جملے میں سمیٹ دیا گیا ہے:

من قال في القرآن بغير علم فليتبوأ مقعده من النار

"جو شخص قرآن کریم کے معاملے میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے"۔

البتہ تفسیر کے اصولوں اور اسلام کے اجماعی طور پر طے شدہ ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے اگر تفسیر میں کسی ایسی رائے کا اظہار کیا جائے جو قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو تو وہ اس حدیث کی وعید میں داخل نہیں ہے، البتہ اس قسم کا اظہار رائے بھی قرآن وسنت کے وسیع و عمیق علم اور اسلامی علوم میں مہارت کے بغیر ممکن نہیں، اور علماء نے اس کے لیے بھی کچھ کارآمد اصول مقرر فرمائے ہیں جو اصولِ فقہ اور اصولِ تفسیر میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں اور ان کا ایک نہایت مفید خلاصہ علامہ بدرالدین زرکشیؒ نے اپنی کتاب "البرھان فی علوم القرآن" کی نوع ۴۱ میں بالخصوص "اقسام التفسیر" کے زیر عنوان (صفحہ ۱۶۴ تا ۱۷۰) بیان فرمایا ہے، یہ پوری بحث نہایت قابل قدر ہے، لیکن چونکہ عربی زبان و علوم کی مہارت کے بغیر اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا اس لیے یہاں اس کا ترجمہ نقل کرنا بے فائدہ ہے، جو عربی دان حضرات چاہیں وہاں ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔[1]

---

(1) علوم القرآن۔ ص ۳۵۳ تا ۳۵۹

تفسیرِ قرآن کا بہترین طریقہ:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ (م: ۷۷۴ھ) فرماتے ہیں:

"تفسیرِ قرآن کا صحیح اور بہترین طریقہ تو یہ ہے کہ اوّل تو قرآن کی تفسیر قرآن سے ہو ـــــ اگر قرآن میں اس کی تفسیر نہ ملے تو سنت سے طلب کی جائے ـــــ وہاں بھی نہ ملے تو اقوالِ صحابہ کی طرف رجوع کیا جائے، وہاں بھی نہ ملے تو اقوالِ تابعینؒ سے طلب کی جائے"۔[1]

تفسیر کی اقسام:

علامہ سلیمان الجملؒ (م: ۱۲۰۴ھ) نے تفسیرِ خازن سے نقل کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"تفسیرالقرآن علی أربعة أوجه منه تفسیر لایسع أحدا جهله ، وتفسیرتعرفه العرب بألسنتها أي لغاتها وتفسیر تعلمه العلماء وتفسیر لایعلمه الا الله"[2]

"تفسیرِ قرآن کی چار قسمیں ہیں۔(۱) ایک تفسیر تو وہ ہے کہ جس سے کسی کو بھی ناواقف اور جاہل رہنے کی گنجائش نہیں (۲) دوسری وہ ہے جسے عرب لوگ اپنی لغات کے ذریعے جانتے ہیں (۳) تیسری وہ ہے جسے علماءِ امت جانتے ہیں (۴) چوتھی وہ ہے جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا"۔

---

(۱) تفسیر ابن کثیر۔ ج۱، ص۳۔ طبع بیروت

(۲) حاشیۃ الجمل۔ ج۱، ص ۲۴۳۔ علامہ سیوطیؒ نے بھی الاتقان میں یہ قول نقل کیا ہے، دیکھئے الاتقان۔ ج۲، ص۱۸۲

تفسیر کے ذیل میں علماءِ کرام مفسرین کے طبقات ذکر کرتے ہیں، ہم بھی یہاں آپ کو مفسرین کے طبقات سے واقف کراتے ہیں۔

یہ طبقات ہمارے استاذِ مکرم حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی رحمہ اللہ (م:۱۴۲۰ھ، ۱۹۹۹ء) نے تفسیر ابن کثیر اردو کی پہلی جلد کے مقدمہ میں ذکر کیے ہیں۔ ہم نے اس میں نہایت معمولی سا تصرف کیا ہے جس کے لیے ہم حضرتؒ کے حضور معذرت خواہ ہیں۔

طبقات المفسرین

علماء کرام نے مفسرین کے طبقات قائم کیے ہیں۔ امام جلال الدین سیوطیؒ نے اپنے عہد تک غالباً آٹھ طبقے قرار دیے ہیں۔ نواب صدیق حسن خان صاحبؒ نے الاکسیر فی اصول التفسیر میں اپنے عہد تک تیرہ طبقات قرار دیے ہیں۔ مولانا ابو محمد عبدالحق دہلویؒ مؤلف تفسیر حقانی نے اپنے عہد تک نو طبقے قائم کیے ہیں اور طبقہ نہم کو نویں صدی سے لے کر چودھویں صدی تک وسعت دی ہے، ایسی وسعت کسی طبقے کو حاصل نہیں۔ یہ وسعت بھی مناسب نہیں۔ یہاں ہم نے طبقہ نہم تک مولانا ابو محمد عبدالحق حقانیؒ کی تقسیم کو نقل کیا ہے۔ اور طبقات دہم ویازدہم ودوازدہم خود قائم کیے ہیں۔

طبقات قائم کرنے سے یہ مقصد نہیں ہے کہ جس قدر اسماء طبقات میں آئے ہیں بس وہی حضرات مفسر ہیں یا وہ ایسے مستند ہیں کہ ان کی ہر بات قابل تسلیم ہے، بلکہ ہر عہد کے دو دو چار چار مفسرین کے نام لکھ دیے گئے ہیں باقی ان کے معاصرین اسی طبقے میں شمار کیے جائیں گے تمام مفسرین کی مکمل فہرست مرتب کرنا ممکن نہیں ہے۔

طبقہ اول: اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحاب مفسر قرآن تھے، لیکن ان میں زیادہ

مشہور یہ دس حضرات تھے ان میں بھی حضرت علی و حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کو تفسیر میں زیادہ ملکہ تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ متوفی ۱۳ھ، عمر فاروق ۲۴ھ، عثمان غنی ۳۵ھ، علی مرتضیٰ ۴۰ھ، عبداللہ بن مسعود ۳۲۔۳۴ھ، عبداللہ بن عباس ۶۸ھ، عبداللہ بن زبیر ۷۳ھ، اُبی بن کعب ۳۵ھ، زید بن ثابت ۴۵ھ، ابوموسیٰ اشعری ۴۴ھ رضی اللہ عنہم۔ ازواجِ مطہرات میں علم تفسیر میں حضرت عائشہ صدیقہؓ ۵۸ھ اور حضرت ام سلمہؓ ۶۳ھ زیادہ مشہور تھیں۔

طبقہ دوم:

مُرّۃ ہمدانی ۷۵یا۷۶ھ، ابوالعالیہ ریاحی ۹۰ھ، سعید بن جُبیر ۹۵ھ، عکرمہ مولیٰ ابن عباس ۱۰۵ھ، ضحاک بن مزاحم ۱۰۵ھ، طاؤس بن کیسان ۱۰۶ھ، حسن بصری ۱۱۰ھ، عطیہ بن سعد عوفی ۱۱۱ھ، عطاء بن ابی رباح ۱۱۲ھ، قتادہ بن دعامہ ۱۱۷ھ، محمد بن کعب قرظی ۱۲۰ھ، مجاہد ۱۲۳ھ، عطاء بن ابی مسلم خراسانی ۱۳۵ھ، زید بن اسلم ۱۳۶ھ، ربیع بن انس ۱۴۰ھ، عبدالرحمن بن زید بن اسلم ۱۸۲ھ، ابومالک، علقمہ ۶۲ھ، اسود بن یزید ۷۵ھ، سفیان ثوری ۱۶۱ھ،

طبقہ سوم:

سفیان بن عیینہ ۱۹۸ھ، وکیع بن جراح ۱۹۷ھ، شعبہ بن حجاج ۱۶۰ھ، یزید بن ہارون ۲۰۶ھ، عبدالرزاق بن ہمام ۲۱۱ھ، آدم بن ابی ایاس ۲۲۰ھ، اسحاق بن راہویہ ۲۳۸ھ، روح بن عبادہ ۲۰۵ھ، عبد بن حمید ۲۴۹ھ، سنید بن داؤد ۲۲۰ھ، ابوبکر بن ابی شیبہ ۲۲۰ھ، ابن جریج ۱۵۰ھ۔۱۶۰ھ، اسماعیل بن عبدالرحمن سدی ۱۲۷ھ، مقاتل بن سلیمان ۱۵۰ھ، محمد ابن السائب کلبی کوفی ۱۴۶ھ، ابن قتیبہ ابومحمد بن عبداللہ بن مسلم دینوری ۲۷۶ھ، محمد بن ثور ۱۹۰ھ، امام بخاری ۲۵۶ھ، ابوحنیفہ دینوری ۲۰۹ھ،

طبقہ چہارم:

ابو جعفر ابن جریر طبری ۳۱۰ھ، ابو القاسم ابراہیم انماطی ۳۰۳ھ، عبد الرحمن بن ابی حاتم ۳۰۵ھ، ابنِ ماجہ ۲۷۳ھ، محمد بن عبد اللہ حاکم ۴۰۵ھ، ابنِ حبان ۳۵۴ھ، ابن مردویہ ۴۱۰ھ، ابو الشیخ عبد اللہ بن محمد ۳۶۹ھ، ابن المنذر ۳۱۸ھ،

طبقہ پنجم:

ابو عبد الرحمن محمد بن حسین سلمی نیشاپوری ۴۱۲ھ، ابو اسحاق احمد ثعالبی ۴۲۷ھ، ابو محمد عبد اللہ جوینی ۴۳۸ھ، ابو القاسم عبد الکریم قشیری ۴۶۵ھ، ابو الحسن احمد واحدی نیشاپوری ۴۶۸ھ، ابو الحسن علی بن ابراہیم ۴۳۰ھ، ابن فورک ۴۰۶،

طبقہ ششم:

ابو القاسم اسماعیل بن محمد اصفہانی ۵۳۵ھ، ابو القاسم حسین راغب اصفہانی ۵۰۳ھ، امام غزالی ۵۰۵ھ، ابو محمد حسین بن محمود بغوی ۵۱۶ھ، ابن برجان ابو الحکم عبد السلام بن عبد الرحمن ۵۳۶ھ، ابو الحسن علی بن عراق خوارزمی ۵۳۹ھ، ابو القاسم محمد بن عمر زمخشری ۵۳۸ھ، ابن العربی ۵۴۳ھ، عبد الرحمن بن علی جوزی ۵۹۷ھ، برہان الدین قونوی ۵۰۱ھ، علی محمد بن عبد الصمد سخاوی ۵۵۸ھ، ابو جعفر محمد بن حسن بن علی طوسی (شیعہ کے امام و مجتہد) ۵۶۱ھ،

طبقہ ہفتم:

امام فخر الدین رازی ۶۰۶ھ، محمد بن ابی بکر رازی ۶۰۶ھ، نجم الدین زاہدی ۶۵۸ھ، ابو عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری قرطبی ۶۷۴ھ، موفق الدین احمد بن یوسف موصلی ۶۸۱ھ، قاضی ناصر الدین بیضاوی ۶۸۵ھ، محی الدین ابن عربی ۶۳۸ھ، ابو محمد روزبھان شیرازی ۶۰۶ھ،

طبقہ ہشتم:

ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی ۷۱۰ھ، ہبۃ اللہ شرف الدین بن عبدالرحیم ۷۱۰ھ، ابوالفداء عمادالدین بن اسماعیل ابن عمر بن کثیر ۷۷۴ھ، شرف الدین عبدالواحد بن المنیر ۷۴۳ھ، قطب الدین محمود بن مسعود شیرازی ۷۱۰ھ، شرف الدین حسن طیبی ۷۴۳ھ، سعدالدین تفتازانی ۷۹۲ھ، شیخ علاء الدین خازن ۷۲۵ھ، قطب الدین رازی ۷۶۶ھ، بدرالدین زرکشی ۷۹۴ھ، حافظ ابن قیم جوزی ۷۵۰ھ، سراج الدین عمر بن ارسلان بلقینی ۸۰۵ھ،

طبقہ نہم:

جلال الدین محلی ۸۶۴ھ، علی بن احمد مہائمی ۸۳۵ھ، ملک العلماء شہاب الدین ۸۳۵ھ، ملا حسین واعظ کاشفی ۹۱۰ھ، عبدالرحمن بن عمر جلال الدین بلقینی ۸۱۸ھ، ابوالسعود محمد بن محمد عمادی ۹۸۲ھ، عصام الدین ابراہیم اسفرائینی ۹۴۳ھ، جلال الدین سیوطی ۹۱۱ھ، ابوطاہر فیروزآبادی ۸۱۷ھ، شیخ نورالدین گازرونی ۹۷۵ھ، ولی الدین عراقی ۸۲۱ھ،

طبقہ دہم:

قاضی شوکانی ۱۲۵۰ھ، قاضی ثناء اللہ پانی پتی ۱۲۲۵ھ، شاہ ولی اللہ دہلوی ۱۱۹۷ھ، شاہ عبدالقادر دہلوی ۱۲۳۰ھ، شاہ عبدالعزیز ۱۲۲۷ھ، علامہ محمود آلوسی بغدادی ۱۲۷۰ھ، نواب صدیق حسن خان ۱۳۰۷ھ، سلیمان الجمل ۱۲۰۴ھ، نواب قطب الدین خان ۱۲۶۵ھ، شیخ نورالدین ہروی ۱۰۱۰ھ، شہاب الدین خفاجی ۱۰۶۹ھ، ملا جیون لکھنوی ۱۱۳۰ھ، شیخ اسماعیل حقی ۱۱۲۷ھ،

طبقہ یازدہم:

شیخ الہند محمود حسن دیوبندی ۱۳۳۹ھ، مولانا عبدالحق حقانی ۱۳۱۸ھ، علامہ محمد رشید رضا

مصری ۱۳۵۴ھ، مولانا عبید اللہ سندھی ۱۳۶۳ھ، شیخ طنطاوی جوہری ۱۳۵۹ھ،

طبقہ دوازدہم: (ہندوپاکستان)

مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا احمد علی لاہوری، خواجہ محمد عبدالحی فاروقی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی۔

منتخب تفسیریں:

حضرت علامہ محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ (م:۱۳۹۷ھ، ۱۹۷۷ء) نے مشکلات القرآن کے مقدمے میں، جس کا نام "یتیمة البیان" ہے، لکھا ہے کہ "میرے نزدیک چار تفسیریں ایسی ہیں جو باقی تفسیروں سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔

(۱) تفسیر کبیر للامام الرازیؒ (۲) تفسیر ابنِ کثیرؒ (۳) روح المعانی للعلامہ الآلوسیؒ
(۴) تفسیر ابو سعود حنفیؒ (م:۹۵۱ھ)"[۱]

تفسیر کا موضوع:

تفسیر کا موضوع نظمِ قرآن ہے اس حیثیت سے کہ اس کے مطالب و مقاصد بیان کیے جائیں۔

شیخ احمد الصاوی (م:۱۲۴۱ھ) فرماتے ہیں:

موضوعه آيات القرآن من حيث فهم معانيها[۲]

تفسیر کا موضوع آیاتِ قرآنیہ ہیں، اس حیثیت سے کہ ان کے معنیٰ کا فہم حاصل ہو۔

---

(۱) یتیمة البیان۔ ص ۲۳۔ اس مقدمہ کا حضرت بنوریؒ کے صاحبزادہ مولانا سید سلیمان یوسف بنوری نے "منتخبات اصول تفسیر و علوم قرآن" کے نام سے اردو ترجمہ کیا ہے، جسے مکتبہ بینات کراچی نے شائع کر دیا ہے۔

(۲) حاشیة الصاوي۔ ج ۱، ص ۷

تفسیر کی غرض وغایت:

تفسیر کی غرض وغایت سعادتِ ابدیہ کا حصول ہے۔ چنانچہ علامہ آلوسیؒ (م:۱۲۷۰ھ) فرماتے ہیں:

غايته الاعتصام بالعروة الوثقى التي لاانفصام لها والوصول إلى سعادة الدارين(۱)

"تفسیر کی غرض وغایت اس مضبوط حلقے کو تھام لینا ہے جو ٹوٹتا نہیں، اور دارین کی سعادتِ ابدیہ کو حاصل کرنا ہے"۔

شیخ احمد الصاویؒ فرماتے ہیں:

وغايته الفوز بسعادة الدارين أما الدنيا فبامتثال الأوامر واجتناب النواهي وأما الاخرة فبالجنة ونعيمها (۲)

"تفسیر کی غرض وغایت دارین کی سعادت کا حاصل کرنا ہے، دنیا میں اللہ کے حکموں پر عمل اور منہیات سے بچ کر اور آخرت میں جنت اور اس کی نعمتوں کو حاصل کرکے"۔

تفسیر کا واضع:

شیخ احمد الصاویؒ فرماتے ہیں:

واضعه الراسخون في العلم من عهد النبي صلى الله عليه وسلم الى هنا على التحقيق كما شهد الله بذلک (۳)

---

(۱) روح المعانی۔ج۱،ص۷

(۲) حاشية الصاوي۔ج۱،ص۸

(۳) حاشية الصاوي۔ج۱،ص۷

''علم تفسیر کے واضع علی التحقیق وہ علماء ہیں جو راسخین فی العلم ہیں، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے سے لے کر موجودہ زمانے تک جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اِس کی گواہی دی ہے''۔

تفسیر کا مرتبہ ومقام:

علامہ سیوطی رحمہ اللہ (م:۹۱۱ھ) فرماتے ہیں:

أما شرفه فلا يخفى قال تعالى يؤتي الحكمة من يشاء ومن يؤتي الحكمة فقدأوتي خيرا كثيرا وأخرج ابن أبي حاتم وغيره من طريق ابن أبي طلحة عن ابن عباس في قوله تعالى يؤتي الحكمة قال المعرفة بالقران ناسخه ومنسوخه ومحكمه ومتشابهه ومقدمه ومؤخره و حلاله وحرامه و أمثاله(۱)

''تفسیر کا شرف ومرتبہ کسی سے مخفی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ جسے چاہتے ہیں حکمت عطا فرمادیتے ہیں، اور جسے حکمت دے دی گئی یقیناً اُسے خیر کثیر دے دی گئی۔ ابنِ ابی حاتم وغیرہ نے ابن ابی طلحہ کے طریق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد یؤتي الحكمة من يشاء کی تفسیر کے بارے میں نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا، حکمت سے مراد قرآن کریم کی معرفت ہے، یعنی اس کے ناسخ ومنسوخ، محکم ومتشابہ، مقدم ومؤخر، حلال وحرام وغیرہ کو جاننا۔ (اس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کی معرفت کا حصول جو قرآن کی تفسیر ہی سے

---

(۱) الاتقان۔ ج۲، ص۱۷۵

ہو سکتا ہے وہ خیر کثیر کا حصول ہے۔ جس نے قرآن کی معرفت حاصل
کر لی اس نے خیر کثیر حاصل کر لی)۔"

تفسیر کی ضرورت وحاجت:

قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے مکمل ضابطہ حیات اور قانونِ فطرت بنا کر اس لیے نازل فرمایا ہے کہ لوگ اِس کا فہم حاصل کر کے اِس پر عمل پیرا ہوں اور یہ بات طے شدہ ہے کہ قرآنِ کریم کا فہم ہر ایک کے لیے اس کے متعلقہ علوم حاصل کیے بغیر ممکن نہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُوْنَ (1)

"ہم اِن مثالوں کو لوگوں کے (سمجھانے کے) لیے بیان کرتے ہیں
مگر ان مثالوں کو بس علم والے ہی سمجھتے ہیں"۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام جو قرآن کریم کے اوّلین مخاطب اور اَفْصَحُ الْعَرَب تھے اور جن کی زبان فصیح عربی تھی ان کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی باوجود اَفصح العرب ہونے کے قرآن کریم کو کَمَاحَقُّہٗ نہیں سمجھ سکے اور قرآن فہمی کے لیے بار بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع فرماتے رہے اور آپ سے قرآن کا فہم حاصل کیا۔ جب صحابہ کرام علیہم الرضوان قرآن کریم کی فہم اور اس کی توضیح وتشریح کے سلسلہ میں تعلیمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے محتاج تھے تو ہماری کیا حیثیت ہے کہ ہم علومِ قرآنیہ حاصل کیے بغیر قرآن فہمی کا دعویٰ کر سکیں بلکہ ہم تو اور زیادہ اِس کے محتاج ہیں کہ قرآن فہمی کے لیے اس کے متعلقہ علوم حاصل کریں کیونکہ نہ تو ہماری زبان عربی ہے اور نہ ہم میں وہ استعداد وصلاحیت ہے جو قرآن فہمی

---

(1) سورۃ العنکبوت، آیت ۴۳

کے لیے ضروری ہے اور ہر انسان کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ قرآن فہمی سے متعلق تمام علوم کو حاصل کر سکے، اسی لیے علماءِ اُمت ہر زمانے میں قرآن کریم کی تفسیریں لکھتے لکھاتے رہے اور اس میں اُنہوں نے اپنی زندگیاں صرف کر دیں، اگر ہر ایک کے لیے قرآن فہمی آسان ہوتی تو اُنہیں تفسیریں لکھنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

یہیں سے اُن لوگوں کی غلط فہمی واضح ہو جاتی ہے جو قرآن کریم کی آیت وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ (بلاشبہ ہم نے قرآن کریم کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے) کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ جب قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے آسان کر دیا ہے تو اس کی تفہیم و تشریح کے لیے کسی لمبے چوڑے علم و فن کی ضرورت نہیں، ہر شخص قرآن کریم کا متن پڑھ کر اس کو سمجھ سکتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ اِس آیت کریمہ میں جو لفظِ ذِکْر آیا ہے اس کے دو معنیٰ ہیں۔(۱) زبانی یاد کرنا(۲) نصیحت حاصل کرنا۔ علامہ محلی رحمہ اللہ (م:۸۶۴ھ) نے جلالین میں اِس کے یہی دو مطلب بتائے ہیں، چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

سَهَّلْنَاهُ لِلْحِفْظِ أَوْ هَيَّأْنَاهُ لِلتَّذَكُّرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ مُتَّعِظٍ بِهٖ وَحَافِظٍ لَهٗ

"ہم نے قرآن کریم کو آسان کر دیا ہے زبانی یاد کرنے کے لیے، یا ہم نے اِسے مہیا کیا ہے نصیحت حاصل کرنے کے لیے تو کیا کوئی ہے جو اِس سے نصیحت حاصل کرے یا اِسے زبانی یاد کرے"۔

ہمیں ان دونوں معنیٰ میں سے کسی سے بھی انکار نہیں ہے، یہ دونوں معنیٰ مراد لیے جا سکتے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ قرآن کریم کا زبانی یاد کرنا جس قدر آسان ہے دنیا کی کسی

اور کتاب کا یاد کرنا اتنا آسان نہیں ۔قرآن کریم ہر عمر میں یاد کیا جا سکتا ہے اور اسے ہر فرد، بچہ، بوڑھا، جوان یاد کر سکتا ہے۔اِسی طرح قرآن کریم میں پیش کی جانے والی نصیحت کی باتوں، سبق آموز واقعات اور عبرت و موعظت کے مضامین سے نصیحت حاصل کرنا بھی کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ہمیں یہ سب تسلیم ہے، اس سے کوئی اختلاف نہیں ۔ہمارا اختلاف اُن لوگوں سے ہے جو قرآن کریم کی تفسیر کو ہر شخص کے لیے آسان قرار دیتے ہیں، خواہ اُس میں اِس کی لیاقت ہو یا نہ ہو۔ ایسے ہی ہمارا اختلاف اُن سے بھی ہے جو آیاتِ قرآنیہ سے احکام کے استخراج اور مسائل کے استنباط کو آسان سمجھتے ہیں اور مندرجہ بالا آیت کو دلیل میں پیش کرتے ہیں، ہمیں یہ تسلیم نہیں، کیونکہ آیت کریمہ کا اگر یہی مطلب ہوتا جو یہ حضرات مراد لیتے ہیں اور قرآن کریم کی تفسیر اتنی ہی آسان ہوتی جتنی یہ سمجھتے ہیں اور آیاتِ قرآنیہ سے احکام کا استخراج اور مسائل کا استنباط اتنا ہی آسان ہوتا جتنا یہ سمجھتے ہیں تو صحابہ کرام کو قرآن کی تفسیر میں کبھی کوئی اشکال پیش نہ آتا اور اُنہیں اِس سلسلہ میں حضور علیہ السلام کی طرف رجوع کی کبھی ضرورت پیش نہ آتی۔ اسی طرح بڑے بڑے مفسرین نے جو اپنی زندگیاں علوم قرآن کی تحصیل میں صرف کیں اُنہیں اس کی ضرورت نہ پڑتی، نیز اُنہیں قرآن فہمی کے لیے اتنی اتنی بڑی تفسیریں لکھنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

صحابہ کرام علیہم الرضوان کا قرآن فہمی کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرنا اور علماءِ اُمت کا علوم قرآن کی تحصیل میں زندگیاں صرف کرنا اور پھر بڑی بڑی تفسیریں لکھنا یہ سب بتلا رہا ہے کہ قرآن کریم کا سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا اِن حضرات نے سمجھ رکھا ہے۔

مختصراً ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کریم کی آیات دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جن میں عام نصیحت کی باتیں، سبق آموز اور عبرت انگیز واقعات اور عبرت و

موعظت کے مضامین بیان کیے گئے ہیں، اس قسم کی آیتیں بلاشبہ آسان ہیں اور جو شخص بھی عربی زبان سے معمولی شدبد رکھتا ہو وہ انہیں سمجھ کر ان سے نصیحت حاصل کر سکتا ہے، بلکہ یہ مقصد قرآن کریم کے مستند تراجم دیکھ کر بھی ایک حد تک حاصل ہو جاتا ہے، مذکورہ بالا آیتِ کریمہ میں اسی مقصد کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے۔

اس کے برخلاف دوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جو احکام و قوانین، عقائد اور علمی مضامین پر مشتمل ہیں۔ اس قسم کی آیتوں کا کماحقہٗ سمجھنا اور ان سے احکام و مسائل مستنبط کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے، جب تک اسلامی علوم میں بصیرت اور پختگی حاصل نہ ہو اس وقت تک قرآن کریم سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

کچھ لوگ استدلال میں آیتِ کریمہ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر قفل لگ رہے ہیں) کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس آیت میں ہر شخص کو قرآن میں تدبر اور غور و فکر کی دعوت دی جا رہی ہے اور اسے چھوڑنے پر ٹوکا جا رہا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص قرآن سمجھ سکتا ہے، قرآن آسان ہے مشکل نہیں۔

ان حضرات کا اس آیت سے استدلال کرنا انتہائی غلط ہے، کیونکہ اس آیت کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں روئے سخن منافقین کی طرف ہے اور بتایا گیا ہے کہ جب کفر و نفاق اور عناد طبیعت میں پرورش پاتے رہتے ہیں اور احکامِ خداوندی سے روگردانی کو وطیرہ بنا لیا جاتا ہے تو اس کا انجام یہی ہوتا ہے کہ ایسے لوگ رحمتِ خداوندی سے دور کر دیے جاتے ہیں، آنکھیں اور کان حق کو سمجھنے اور دیکھنے سے بے کار ہو جاتے ہیں، قرآن کو سمجھنے کا شعور سلب ہو جاتا ہے اور دلوں پر تالے ڈال دیے جاتے ہیں اور بھلی بات دل میں اثر نہیں کرتی اور دل میں اتر ہی نہیں سکتی۔ اس پھٹکار کا نتیجہ یہ

ہوتا ہے کہ ایسے لوگ کھلم کھلا کفر کی طرف عود کر جاتے ہیں۔ اِس آیت کا تعلق زیرِ بحث موضوع سے ہے ہی نہیں، اس لیے اِس آیت سے ان حضرات کا استدلال کرنا غلط اور بے کار ہے۔

ان حضرات کو چاہیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن ارشادات کو پیش نظر رکھیں جن میں آپ نے تفسیر سے متعلق علم حاصل کیے بغیر محض اپنی رائے سے تفسیر کرنے پر وعید بیان فرمائی ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"مَنْ تَكَلَّمَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَقَدْ أَخْطَأَ"(۱)

جو شخص قرآن کریم کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ کلام کرتا ہے تو اگر وہ صحیح بات بھی کہتا ہے تو غلط کرتا ہے۔

ایک دوسرے مقام پر آپ نے فرمایا:

"مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"(۲)

جو شخص قرآن کریم کے بارے میں علم کے بغیر کوئی بات کرے تو وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے۔

اب تک جو باتیں عرض کی گئیں یہ تو تفسیر سے متعلق تھیں اور تفسیر چونکہ قرآن کریم کی ہوتی ہے اس لیے کچھ باتیں قرآن کریم سے متعلق عرض کی جاتی ہیں۔

قرآن کریم کا نام اور وجہ تسمیہ:

قرآن کریم جو اللہ تعالیٰ کا کلام اور اُس کی مقدس کتاب ہے اس کے بہت سے نام ہیں جو خود قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ علامہ ابو المعالی (م:۴۹۴ھ) نے پچپن نام شمار کیے ہیں۔ بعض علماء نے اِن کی تعداد نوّے سے بھی زیادہ بتلائی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ

---

(۱) الاتقان فی علوم القرآن۔ ج ۲، ص ۱۷۹

(۲) الاتقان فی علوم القرآن۔ ج ۲، ص ۱۷۹

دیکھا جائے تو کتاب اللہ کا یہ نام کفارِ عرب کی تردید میں رکھا گیا ہے، وہ کہا کرتے تھے

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱-۲۶)

"تم اس قرآن کو نہ سنا کرو اور اس کی تلاوت کے دوران شور وغل کیا کرو تاکہ تم غالب رہو"۔

اِن کفار کے برخلاف "قرآن" نام رکھ کر اشارہ فرمادیا گیا کہ قرآن کریم کی دعوت کو اِن اوچھے ہتھکنڈوں سے دبایا نہیں جاسکتا، یہ کتاب پڑھنے کے لیے نازل ہوئی ہے اور قیامت تک پڑھی جاتی رہے گی۔

قرآن کی اصطلاحی تعریف:

علامہ نسفیؒ (م: ۷۱۰ھ) نے "المنار" میں قرآن کریم کی تعریف اس طرح کی ہے:

فَالْقُرْاٰنُ الْمُنَزَّلُ عَلَى الرَّسُوْلِ عَلَيْهِ السَّلَامُ الْمَكْتُوْبُ فِي الْمَصَاحِفِ الْمَنْقُوْلُ عَنْهُ نَقْلًا مُتَوَاتِرًا بِلَاشُبْهَةٍ [1]

"قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا وہ کلام ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، مصاحف میں لکھا گیا، اور آپ سے بغیر کسی شک وشبہ کے تواتر کے ساتھ نقل کیا گیا"۔

نزولِ قرآن:

قرآن کریم اللہ کا کلام ہے اس لیے ازل سے لوحِ محفوظ میں موجود ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

"بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ" (۸۵-۲۳) "بلکہ یہ قرآن مجید ہے لوحِ محفوظ میں"۔

---

(۱) نورالانوار۔ ص ۷

انہوں نے قرآن کریم کی صفات مثلاً مجید، کریم، حکیم، مبین وغیرہ کو نام قرار دے کر تعداد اس حد تک پہونچادی ہے، ورنہ صحیح معنیٰ میں قرآن کریم کے نام کل پانچ ہیں۔

(۱) القرآن (۲) الفرقان (۳) الذکر (۴) الکتاب (۵) التنزیل۔

خود قرآن کریم نے اپنے لیے یہ پانچوں الفاظ اسمِ عَلَم کے طور پر ذکر فرمائے ہیں۔ اِن میں سب سے زیادہ مشہور و معروف نام "قرآن" ہے، چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے کم از کم اکسٹھ (۶۱) مقامات پر اپنے کلام کو اِسی نام سے یاد کیا ہے۔

اس بارے میں اختلاف ہے کہ لفظِ قرآن مشتق ہے یا نہیں؟۔ اگر مشتق ہے تو کس سے ہے؟۔

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اَلقرآن کا لفظ جس پر الف لام تعریف داخل کیا گیا ہے، وہ نہ مشتق ہے اور نہ مہموز ہے، بلکہ یہ ایک غیر مشتق لفظ ہے اور اِس کو اُس کلام کے نام کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ گویا امام شافعیؒ کے نزدیک "قرآن" کتابِ الٰہی کا اِسی طرح نام ہے جس طرح تورات اور انجیل کتبِ الٰہیہ کے نام ہیں۔

امام ابوالحسن اشعریؒ (م: ۳۲۴ھ) اور اُن کے متبعین کا قول ہے کہ قرآن کا لفظ مشتق ہے اور قَرَنَ الشَّیْئَ بِالشَّیْءِ سے نکلا ہے جس کے معنیٰ ملانے کے آتے ہیں کیونکہ قرآن کی سورتیں اور آیتیں باہم ملی جلی ہوتی ہیں اِس لیے اُن کو قرآن کہا جاتا ہے۔

علامہ لِحیانیؒ کا قول ہے کہ قُرآن بروزنِ غُفرَان مصدر مہموز ہے۔ اِس کا مادہ قَرَأَ ہے۔ قرآن کو یہ نام اِس لیے دیا گیا ہے کہ یہ پڑھا جاتا ہے، گویا "قرآن" مصدر بمعنی اسم مفعول مَقْرُوْءٌ(۱) کے ہے، جس کا مطلب ہے پڑھی ہوئی کتاب۔

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے "علوم القرآن" از ڈاکٹر صبحی صالح، ص ۲۵

پھر لوحِ محفوظ سے اس کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ پورا کا پورا آسمانِ دنیا کے بیتُ العزّت میں نازل ہوا جسے بیت المعمور بھی کہا جاتا ہے، جو کعبۃ اللہ کے محاذات میں آسمان پر فرشتوں کی عبادت گاہ ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم کا دوسرا تدریجی نزول اس وقت شروع ہوا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس سال تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم تھوڑا تھوڑا کر کے حسبِ ضرورت نازل کیا جاتا رہا یہاں تک کہ ۲۳ سال میں اِس کی تکمیل ہوئی۔

قرآن کریم میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں، ایک اِنْزَال، دوسرا تَنْزِیْل۔ اِنْزَال کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک ہی دفعہ میں مکمل نازل کر دینا اور تنزیل کے معنی ہیں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنا، قرآن کریم نے اپنے لیے پہلا لفظ جہاں کہیں استعمال کیا ہے اس سے مراد عموماً وہ نزول ہے جو لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا کی طرف ہوا۔ ارشاد ہے اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (الدخان۔۲) "بلاشبہ ہم نے اِس کو ایک مبارک رات میں اُتارا"۔

اور تنزیل سے مراد وہ نزول ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بتدریج ہوا۔ ارشاد ہے:

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا (بنی اسرائیل۔ آیت ۱۰۶) "قرآن کو ہم نے متفرق طور سے اس لیے اُتارا تاکہ آپ اِسے لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں، اور ہم نے اِسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا"۔

قرآن کریم کے سات حروف پر نازل ہونے کا مطلب:

احادیثِ مبارکہ میں قرآن کریم کے متعلق بتلایا گیا ہے کہ وہ سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے، چنانچہ ایک حدیثِ پاک جو سیّد القراء حضرت اُبَیّ بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں آتا ہے:

لَقِیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ جِبْرِیْلَ فَقَالَ یَا

جِبْرِيْلُ إِنِّيْ بُعِثْتُ إِلَىٰ أُمَّةٍ أُمِّيِّيْنَ مِنْهُمُ الْعَجُوْزُ وَالشَّيْخُ الْكَبِيْرُ وَالْغُلَامُ وَالْجَارِيَةُ وَالرَّجُلُ الَّذِيْ لَمْ يَقْرَأْ كِتَابًا قَطُّ قَالَ يَا مُحَمَّدُ إِنَّ الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلَىٰ سَبْعَةِ أَحْرُفٍ (۱)

"حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جبریل امین سے ملاقات ہوئی تو آپ نے فرمایا: جبریل! میں ایک ناخواندہ اُمت کی طرف بھیجا گیا ہوں ، جن میں بوڑھیاں بھی ہیں، بوڑھے بھی، لڑکے بھی ہیں اور لڑکیاں بھی، اور ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ جبریل امین نے (یہ سن کر) فرمایا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بات یہ ہے کہ قرآن کریم سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے" (جس کے لیے جس طریقے میں آسانی ہو اور وہ اس طریقے پر پڑھ لے تو اس کے لیے کافی ہو جائے گا)۔

اسی طرح ایک حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلَىٰ سَبْعَةِ أَحْرُفٍ فَاقْرَؤُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ (۲)

یعنی قرآن کریم سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے، ان میں سے جو طریقہ بھی تمہیں آسان لگے اس طریقے سے پڑھ لیا کرو۔

فـ: ان احادیث مبارکہ میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ قرآن کریم سات حرفوں پر نازل

---

(۱) الجامع للترمذي۔ج ۲، ص ۱۲۲، باب ماجاء أن القرآن أنزل على سبعة أحرف۔

مشکوٰۃ المصابیح، ص ۱۹۲

(۲) صحیح البخاري۔ج ۲، ص ۷۴۷، باب أنزل القرآن على سبعة أحرف

کیا گیا ہے، اس میں سوال ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے سات حرفوں پر نازل ہونے سے کیا مراد ہے؟۔ اس سلسلہ میں شارحینِ حدیث کا شدید اختلاف پایا جاتا ہے، ہر ایک نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق مراد متعین کرنے کی کوشش کی ہے، حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم اس سے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"ہمارے نزدیک قرآن کریم کے "سات حروف" کی سب سے بہتر تشریح اور تعبیر یہ ہے کہ حدیث میں "حروف کے اختلاف" سے مراد قراءتوں کا اختلاف ہے سات حروف سے مراد اختلافِ قراءات کی سات نوعیتیں ہیں، چنانچہ قراءتیں تو اگرچہ سات سے زائد ہیں لیکن ان قراءتوں میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ سات اقسام میں منحصر ہیں"۔(۱)

اختلافِ قراءات کی سات نوعیتیں کیا ہیں، ان کو بیان کرتے ہوئے مولانا موصوف تحریر فرماتے ہیں:

"یہ سب حضرات اس بات پر تو متفق ہیں کہ حدیث میں سات حروف سے مراد اختلافِ قراءات کی سات نوعیتیں ہیں لیکن پھر ان نوعیتوں کی تعیین میں ان حضرات کے اقوال میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک نے قراءات کا استقراء اپنے طور پر الگ الگ کیا ہے، ان میں جن صاحب کا استقراء سب سے زیادہ منضبط، مستحکم اور جامع و مانع ہے، وہ امام ابوالفضل رازی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، فرماتے ہیں،

کہ قراءات کا اختلاف سات اقسام میں منحصر ہے:۔

۱۔ اسماء کا اختلاف، جس میں اِفراد، تثنیہ وجمع اور تذکیر و تانیث دونوں

---

(۱) علوم القرآن۔ ص ۱۰۶

کا اختلاف داخل ہے، (اس کی مثال وُہی وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ ہے، جو ایک قراءت میں وَتَمَّتْ كَلِمَاتُ رَبِّكَ بھی پڑھا گیا ہے)

۲۔ افعال کا اختلاف، کہ کسی قراءت میں صیغہ ماضی ہو، کسی میں مضارع اور کسی میں امر (اس کی مثال رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا ہے کہ ایک قراءت میں اس کی جگہ رَبُّنَا بَعَّدَ بَيْنَ أَسْفَارِنَا بھی آیا ہے)

۳۔ وجوہِ اعراب کا اختلاف، جس میں اعراب یا حرکات مختلف قراءتوں میں مختلف ہوں (اس کی مثال وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ اور وَلَا يُضَارُّ كَاتِبٌ اور ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ اور ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدِ)

۴۔ الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف، کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ کم اور دوسری میں زیادہ ہو (مثلاً ایک قراءت وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَى ہے اور دوسری میں وَالذَّكَرَ وَالْأُنْثَى ہے، اور اس میں وَمَا خَلَقَ کا لفظ نہیں ہے، اسی طرح ایک قراءت میں تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ہے اور دوسری میں تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ)

۵۔ تقدیم و تاخیر کا اختلاف، کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ مقدم اور دوسری میں مؤخر ہے (مثلاً وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ اور وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ)

۶۔ بدلیت کا اختلاف، کہ ایک قراءت میں ایک لفظ ہے اور دوسری قراءت میں اس کی جگہ دوسرا لفظ (مثلاً نُنْشِزُهَا اور نَنْشُرُهَا، نیز فَتَبَيَّنُوا اور فَتَثَبَّتُوا، طَلْحٍ اور طَلْعٍ)

۷۔ لہجوں کا اختلاف، جس میں تفخیم، ترقیق، امالہ، قصر، مد، ہمز،

اظہار اور ادغام وغیرہ کے اختلافات شامل ہیں، (مثلاً مُوسیٰ ایک قراءت میں امالہ کے ساتھ ہے، اور اُسے مُوسَیٰ کی طرح پڑھا جاتا ہے اور دوسری میں بغیر امالہ کے ہے)(۱)

سورت کی لغوی تحقیق:

سُورَۃ یا تو سُوْرُ الْبَلَدِ سے ماخوذ ہے جس کے معنی شہر کی چار دیواری کے ہوتے ہیں جن میں شہر گھرا ہوا ہوتا ہے۔ سورت بھی چونکہ قرآن کریم کا ایک محدود حصہ ہوتا ہے جس کا مستقل طور پر احاطہ کیا گیا ہوتا ہے اِس لیے اسے سورت کہتے ہیں۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ سورت چونکہ فنونِ علمیہ اور انواع و اقسام کے فوائد پر مشتمل ہوتی ہے جس طرح کہ شہر پناہ اپنے اندرون کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے اِس لیے اسے سورت کہتے ہیں۔

یا پھر سُورَۃ اُس سورت سے ماخوذ ہے جس کے معنی مرتبہ کے ہوتے ہیں ایسی صورت میں سورت کو سورت یا تو اس لیے کہیں گے کہ سورتیں بھی بمنزلہ درجوں اور مرتبوں کے ہوتی ہیں جن پر قاری ترقی کرتا جاتا ہے نیز خود سورتیں بھی طوال، اوساط اور قصار پر مرتب ہوتی ہیں یا اِس لیے کہیں گے کہ دین میں اِن کی رفعتِ شان اور جلالتِ مرتبت مُسَلَّم ہے۔

سورت کے اصطلاحی معنٰی:

سورت کی تعریف اِس طرح کی گئی ہے "قُرْآنٌ يَشْتَمِلُ عَلىٰ آيٍ ذِيْ فَاتِحَةٍ وَ خَاتِمَةٍ وَأَقَلُّهَا ثَلَاثُ آيَاتٍ"۔(۲) "قرآن کریم کا وہ حصہ جو چند آیات پر مشتمل ہوتا ہے، اس کا آغاز بھی ہوتا ہے اور اختتام بھی ہوتا ہے اور اس میں کم از کم تین آیتیں ہوتی ہیں"۔

---

(۱) علوم القرآن۔ ص ۱۰۷

(۲) الاتقان۔ ج ۱، ص ۵۲

سورتوں کے نام اوران کی ترتیب توقیفی ہے:

سورتوں کے نام اوراُن کی ترتیب توقیفی ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوئی ہے۔علامہ سیوطیؒ (م:۹۱۱ھ) نے علامہ کرمانیؒ کی البرھان کے حوالے سے نقل کیاہے کہ علامہ کرمانیؒ فرماتے ہیں:

تَرْتِيْبُ السُّوَرِ هٰكَذَا هُوَعِنْدَاللهِ فِي اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ عَلٰى هٰذَا التَّرْتِيْبِ وَ عَلَيْهِ كَانَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْرِضُ عَلٰى جِبْرِيْلَ كُلَّ سَنَةٍ مَاكَانَ يَجْتَمِعُ عِنْدَهٗ مِنْهُ (۱)

”قرآن کریم کی سورتوں کی ترتیب اللہ تعالیٰ کے یہاں لوحِ محفوظ میں بعینہ اِسی طرح ہے (جیساکہ اب قرآن کریم میں سورتوں کی ترتیب ہے)اور حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم اِسی ترتیب کے مطابق قرآن کے اُتنے حصہ کا جونزول کے بعد آپ کے پاس جمع ہوجاتا تھا،ہرسال جبریل امین سے دور کیاکرتے تھے“۔

سورتوں کی تعداد:

قرآن کریم میں کل ایک سوچودہ(۱۱۴)سورتیں ہیں، جن میں سے بالاتفاق بیس(۲۰)مدنی ہیں، ستتر(۷۷)مکّی ہیں۔سترہ مختلف فیہ ہیں اورایک قول کے مطابق بیس(۲۰)مدنی ہیں،بیاسی(۸۲)مکّی ہیں اور بارہ(۱۲)مختلف فیہ ہیں۔

مکی سورت:

مکی سورت وہ کہلاتی ہے جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہوخواہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہویااس کے مضافات میں۔

---

(۱) الاتقان۔ج۱،ص ۶۲

مدنی سورت:

مدنی سورت وہ کہلاتی ہے جو ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہو خواہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہو یا کہیں اور۔(۱)

مکہ مکرمہ میں نازل ہونے والی سب سے پہلی سورت سورۃ العلق ہے اور سب سے آخری میں اختلاف ہے۔ بقول حضرت ابن عباسؓ کے سورۂ عنکبوت ہے اور بقول ضحاکؒ اور عطاء کے سورۂ مومنون ہے اور بقول مجاہدؒ کے سورۂ مطففین ہے۔

مدینہ طیبہ میں نازل ہونے والی سب سے پہلی سورت سورۃ البقرۃ ہے اور سب سے آخری سورت میں اختلاف ہے، بعض نے سورۂ توبہ اور بعض نے سورۂ مائدہ بتلائی ہے۔(۲)

یاد رہے کہ یہ کوئی خاص اختلاف نہیں ہے، صحابہ کرام میں سے جسے جو معلوم ہوا اس نے وہ ذکر کر دیا، کیونکہ نبی علیہ السلام سے اِس سلسلہ میں کچھ مروی نہیں، اگر آپ سے کچھ مروی ہوتا تو اختلاف کی گنجائش ہی نہ رہتی۔

سورتوں کی ترتیب:

سورتوں کی ترتیب دو طرح کی ہے، ایک ترتیبِ نزولی اور ایک ترتیبِ تلاوت۔ موجودہ مصاحف میں ترتیبِ تلاوت ہے، ترتیبِ نزولی نہیں، اِس موقع پر حاشیۃ الجمل کے حوالے سے ترتیبِ نزولی ذکر کی جاتی ہے۔

سورتوں کی ترتیبِ نزولی:

(۱) اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ (۲) ن وَالْقَلَمِ
(۳) يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (۴) يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ
(۵) تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ (۶) إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ

---

(۱) الاتقان۔ج۱، ص۔۔۔۔ حاشیۃ الجمل۔ج۱، ص۸

(۲) حاشیۃ الجمل۔ج۱، ص۳

(۷) سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى
(۸) وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى
(۹) وَالْفَجْرِ
(۱۰) وَالضُّحٰى
(۱۱) أَلَمْ نَشْرَحْ
(۱۲) وَالْعَصْرِ
(۱۳) وَالْعَادِيَاتِ
(۱۴) إِنَّا أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ
(۱۵) أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ
(۱۶) أَرَأَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ
(۱۷) قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ.
(۱۸) اَلْفِيْل
(۱۹) قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ
(۲۰) وَالنَّجْمِ
(۲۱) عَبَسَ وَتَوَلّٰى
(۲۲) إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ
(۲۳) وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا
(۲۴) اَلْبُرُوْج
(۲۵) وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ
(۲۶) لِإِيْلٰفِ قُرَيْشٍ
(۲۷) اَلْقَارِعَةُ
(۲۸) اَلْقِيَامَةُ
(۲۹) اَلْهُمَزَةُ
(۳۰) اَلْمُرْسَلَاتِ
(۳۱) قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ
(۳۲) اَلْبَلَدِ
(۳۳) اَلطَّارِقْ
(۳۴) اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ
(۳۵) صٓ وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ
(۳۶) اَلْأَعْرَاف
(۳۷) اَلْجِنُّ
(۳۸) يٰسٓ
(۳۹) اَلْفُرْقَانُ
(۴۰) فَاطِر
(۴۱) مَرْيَم
(۴۲) طٰهٰ
(۴۳) اَلْوَاقِعَةُ
(۴۴) اَلشُّعَرَآء
(۴۵) اَلنَّمْل
(۴۶) اَلْقَصَص

(۴۷)بَنِيْ اِسْرَائِيْل (۴۸)يُوْنُس
(۴۹)هُوْد (۵۰)يُوْسُف
(۵۱)حِجْر (۵۲)اَلْاَنْعَام
(۵۳)اَلصَّافَّاتْ (۵۴)لقمان
(۵۵)سَبَاْ (۵۶)اَلزُّمَر
(۵۷)اَلْمُؤْمِن (۵۸)حٰمٓ السَّجْدَة
(۵۹)حٰمٓ عٓسٓقٓ (۶۰)اَلزُّخْرُف
(۶۱)اَلدُّخَان (۶۲)اَلْجَاثِيَة
(۶۳)اَلْاَحْقَاف (۶۴)اَلذَّارِيَات
(۶۵)الغاشية (۶۶)الكهف
(۶۷)اَلنَّحْل (۶۸)نُوْح
(۶۹)اِبْرَاهِيْم (۷۰)اَلْاَنْبِيَاء
(۷۱)اَلْمُؤْمِنُوْنَ (۷۲)الٓمٓ تَنْزِيْل السَّجْدَة
(۷۳)اَلطُّوْر (۷۴)اَلْمُلْک
(۷۵)اَلْحَاقَّة (۷۶)سَاَلَ سَائِلٌ
(۷۷)عَمَّ يَتَسَاءَلُوْن (۷۸)اَلنَّازِعَات
(۷۹)اِذَاالسَّمَاءُ انْفَطَرَتْ (۸۰)اِذَاالسَّمَاءُانْشَقَّتْ
(۸۱)اَلرُّوْم (۸۲)اَلْعَنْكَبُوْت
(۸۳)وَيْلٌ لِلْمُطَفِّفِيْنَ (۸۴)اَلْبَقَرَة
(۸۵)الاَنفَال (۸۶)آل عِمْرَان

(۸۷)اَلْأَحْزَاب
(۸۸)اَلْمُمْتَحِنَة
(۸۹)اَلنِّسَاء
(۹۰)إِذَازُلْزِلَتْ
(۹۱)اَلْحَدِيْد
(۹۲)مُحَمَّد
(۹۳)اَلرَّعْد
(۹۴)اَلرَّحْمٰن
(۹۵)هَلْ أَتٰى عَلَى الْإِنْسَانِ
(۹۶)اَلطَّلَاق
(۹۷)اَلْبَيِّنَة
(۹۸)اَلْحَشْر
(۹۹)اَلْفَلَق
(۱۰۰)اَلنَّاس
(۱۰۱)إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللهِ
(۱۰۲)اَلنُّوْر
(۱۰۳)اَلْحَجّ
(۱۰۴)اَلْمُنَافِقُوْن
(۱۰۵)اَلْمُجَادَلَة
(۱۰۶)اَلْحُجُرَات
(۱۰۷)اَلتَّحْرِيْم
(۱۰۸)اَلصَّفّ
(۱۰۹)اَلْجُمُعَة
(۱۱۰)اَلتَّغَابُن
(۱۱۱)اَلْفَتْح
(۱۱۲)اَلتَّوْبَة
(۱۱۳)اَلْمَائِدَة
(۱۱۴)اَلْفَاتِحَة

اِس کا نزول دوبار ہوا، ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں اور ایک بار مدینہ منورہ میں

شانِ نزول

قرآن فہمی کے لیے آیات و سُوَر کا شانِ نزول یا سبب نزول جاننا ضروری ہے، اس کے بغیر صحیح معنی میں قرآن فہمی ممکن نہیں۔

شانِ نزول یا سببِ نزول سے کیا مراد ہے؟ اس کے سمجھنے کے لیے یہ بات ذہن میں رکھ لیجیے کہ قرآن کریم کی آیتیں بعض تو وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ازخود نازل فرمائیں، کوئی خاص واقعہ یا کوئی سوال وغیرہ ان کے نزول کا سبب نہیں بنا، بعض آیات ایسی ہیں کہ جن

کا نزول کسی خاص واقعہ کی وجہ سے یا کسی کے سوال کے جواب میں ہوا جسے اُن آیتوں کا پسِ منظر کہنا چاہیے۔ یہ پسِ منظر مفسرین کی اصطلاح میں سببِ نزول یا شانِ نزول کہلاتا ہے۔
منکرینِ حدیث اور جدید مفکرین اسبابِ نزول کا انکار کرتے ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ قرآن کریم بذاتِ خود اتنا واضح ہے کہ اِس کی تشریح کے لیے اسبابِ نزول کو جاننے کی کوئی ضرورت نہیں، ان حضرات کا یہ خیال بالکل غلط ہے، اسبابِ نزول کا علم تفسیر قرآن کے لیے نہایت ضروری ہے، اور اس کے بہت سے فائدے ہیں، ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اس سے احکام کی حکمتیں معلوم ہوتی ہیں اور یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے کن حالات میں اور کیوں نازل فرمایا؟۔
کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سببِ نزول کے جانے بغیر آیت کا صحیح مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آتا، اگر سببِ نزول سامنے نہ ہو تو انسان آیت کا بالکل غلط مطلب سمجھ لیتا ہے۔
کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قرآن کریم ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کا شانِ نزول سے گہرا تعلق ہوتا ہے، اگر ان کا صحیح پسِ منظر معلوم نہ ہو تو وہ الفاظ معاذاللہ بے فائدہ اور بعض اوقات بے جوڑ معلوم ہونے لگتے ہیں جس سے قرآن کی فصاحت وبلاغت پر حرف آتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی فائدے ہیں جن کی بناء پر سببِ نزول کا جاننا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ناسخ و منسوخ

علوم قرآن میں ایک بحث ناسخ و منسوخ کی آتی ہے جو ایک انتہائی اہم بحث ہے۔ یہاں ہم اس کے بارے میں مختصر معلومات ذکر کریں گے جس سے آپ کے سامنے نسخ کی حقیقت، اس کی اقسام، نسخ کے استعمال میں متقدمین اور متاخرین کی آراء کا فرق، فرقِ باطلہ کے نسخ کے بارے میں شبہات اور اُن کے شافی جوابات آجائیں گے۔

نسخ کے معنیٰ:

لغت میں نسخ کے معنی مٹانے اورزائل کرنے کے آتے ہیں اور اصطلاح میں کسی حکم شرعی کو کسی دلیلِ شرعی سے ختم کر دینا نسخ کہلاتا ہے۔
مطلب یہ ہے کہ بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ کسی زمانے کے حالات کے مناسب ایک حکمِ شرعی نافذ فرماتے ہیں، پھر کسی دوسرے زمانے میں اپنی حکمتِ بالغہ کے پیشِ نظر اس حکم کو ختم کرکے اس کی جگہ کوئی نیا حکم جاری فرمادیتے ہیں، اِس عمل کو نسخ کہا جاتا ہے اور اس طرح جو پہلا حکم ختم کیا جاتا ہے اُسے منسوخ اور جو نیا حکم جاری کیا جاتا ہے اُسے ناسخ کہتے ہیں۔
مفسرین کا کہنا ہے کہ قرآن کریم میں تین طرح کا نسخ واقع ہوا ہے (۱) تلاوۃ اور حکم دونوں منسوخ ہوگئے[1] (۲) تلاوۃ منسوخ ہوگئی، حکم باقی رہا۔[2] (۳) تلاوۃ باقی رہی حکم منسوخ ہوگیا۔[3]

متقدمین ومتاخرین کے درمیان استعمالِ نسخ میں فرق:

یہاں یہ بات بھی سمجھتے چلیں کہ لفظِ نسخ کے استعمال میں علماءِ متقدمین ومتاخرین کے درمیان اصطلاح کا ایک فرق رہا ہے جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان منسوخ آیات کی تعداد میں اچھا خاصا اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔ متقدمین کی اصطلاح میں لفظِ "نسخ" ایک

---

(۱) جیسے حضرت عائشہؓ کا قول کان مما یتلی فی کتاب " عشر رضعات یحرمن ثم نسخ بخمس رضعات یحرمن " اس کی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہوگئے۔

(۲) جیسے الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموھما ۔ اس کی تلاوت منسوخ ہوگئی لیکن حکم باقی ہے۔

(۳) جیسے آیت کریمہ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ اس کا حکم آیت میراث يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ الآیۃ سے منسوخ ہوگیا، لیکن تلاوت باقی ہے اور جیسے آیت کریمہ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ اس کا حکم آیت مبارکہ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا سے منسوخ ہوگیا، لیکن تلاوت باقی ہے۔

وسیع مفہوم کا حامل تھا اور اس میں بہت سی وہ صورتیں داخل تھیں جو بعد کے علماء کی اصطلاح میں نسخ نہیں کہلاتیں، مثلاً متقدمین کے نزدیک عام کی تخصیص اور مطلق کی تقیید وغیرہ بھی نسخ کے مفہوم میں داخل تھیں، چنانچہ اگر ایک آیت میں عام الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور دوسری میں انہیں کسی خاص صورت سے مخصوص کر دیا گیا ہے تو علماءِ متقدمین پہلی کو منسوخ اور دوسری کو ناسخ قرار دے دیتے تھے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ پہلا حکم بالکلیہ ختم ہو گیا، بلکہ مطلب یہ ہوتا تھا کہ پہلی آیت سے جو عموم سمجھ میں آتا تھا دوسری آیت نے اس کو ختم کر دیا۔

اس کے برخلاف متاخرین کے نزدیک "نسخ" کا مفہوم اتنا وسیع نہیں، وہ صرف اس صورت کو نسخ قرار دیتے ہیں جس میں سابقہ حکم کو بالکلیہ ختم کر دیا گیا ہو، محض عام میں تخصیص یا مطلق میں تقیید پیدا ہو جائے تو وہ اسے نسخ نہیں کہتے، اصطلاح کے اس فرق کی وجہ سے متقدمین کے نزدیک قرآن کریم میں منسوخ آیات کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ معمولی فرق کی وجہ سے ایک آیت کو منسوخ اور دوسری کو ناسخ قرار دے دیتے تھے، لیکن متاخرین کی اصطلاح کے مطابق منسوخ آیات کی تعداد بہت کم ہے، متقدمین نے تقریباً پانچ سو آیات میں نسخ ثابت کیا تھا جس میں معمولی سی تبدیلی قید و شرط یا استثناء وغیرہ کو بھی شامل کیا تھا۔ حضرات متاخرین میں علامہ سیوطیؒ نے صرف بیس آیتوں کو منسوخ قرار دیا، اِن کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اِن میں بھی تطبیق کی صورت پیدا کر کے صرف پانچ آیتوں کو منسوخ فرمایا ہے جن میں کوئی تطبیق بغیر تاویل بعید کے نہیں ہو سکتی، یہ امر اِس لحاظ سے مستحسن ہے کہ احکام میں اصل بقاءِ حکم ہے، نسخ خلافِ اصل ہے، اس لیے جہاں آیت کے معمول بہا ہونے کی کوئی توجیہ ہو سکتی ہے اس میں بلا ضرورت نسخ ماننا درست نہیں لیکن اس تقلیل کا یہ منشا ہر گز نہیں ہو سکتا کہ مسئلہ نسخ اسلام یا قرآن پر کوئی عیب تھا جس کے ازالہ کی کوشش چودہ سو برس تک چلتی رہی،

آخری انکشاف حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ہوا جس میں منسوخ آیات گھٹتے گھٹتے پانچ رہ گئیں، اور اب اس بات کا انتظار ہے کہ کوئی جدید محقق ان پانچ کا بھی خاتمہ کرکے بالکل صفر تک پہنچادے۔

یاد رہے کہ تمام اہل سنت و الجماعت قرآن کریم میں نسخ کے وقوع کے قائل ہیں اسی لیے اُمت میں یہ مسئلہ اجماعی رہا ہے۔ کفار میں سے یہودی قرآن کریم میں نسخ کے وقوع کی وجہ سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے تھے جس کا جواب اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کریم میں مرحمت فرمادیا تھا۔

چنانچہ ارشاد ہے مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَآ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ "جس آیت کو بھی ہم منسوخ کرتے ہیں یا بھلاتے ہیں اُس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں، کیا نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے"۔

منکرینِ نسخ کا شبہہ اور اس کا جواب:

معتزلہ میں سے ابو مسلم اصفہانی نے نسخ کے وقوع کا انکار کیا ہے، موجودہ دور میں تمام منکرینِ حدیث اور جدید منکّرین نسخ کا انکار کرتے ہیں۔ اِن کا بڑا شبہہ یہ ہے کہ قرآن میں نسخ کا ہونا ایک عیب ہے، اس سے العیاذ باللہ ایک تو اللہ تعالیٰ کی طرف جہالت و نادانی کا انتساب لازم آتا ہے، دوسرے یہ بات خلافِ حکمت و مصلحت معلوم ہوتی ہے کہ قرآن میں کوئی آیت ایسی ہو کہ جو محض تبرکاً تلاوت کے لیے باقی رہ جائے اور اس پر عمل کا سلسلہ ختم کردیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ منکرین نسخ، نسخ کی حقیقت کو یا تو سمجھے نہیں یا اس سے تجاہل برتتے ہیں، جس کی وجہ سے اُنہیں یہ شبہات پیش آتے ہیں اگر یہ لوگ اس کی حقیقت کو سمجھتے تو اُنہیں اِس قسم کے شبہات پیش نہ آتے، ہم اس موقع پر حضرت مفتی محمد شفیع صاحب

رحمہ اللہ کی مختصر تحریر پیش کرتے ہیں جس سے نسخ کی حقیقت واضح ہو کر اس قسم کے شبہات کافور ہو جاتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"دنیا کی حکومتوں اور اداروں میں کسی حکم کو منسوخ کر کے دوسرا حکم جاری کر دینا مشہور و معروف ہے، لیکن انسانوں کے احکام میں نسخ کبھی اِس لیے ہوتا ہے کہ پہلے کسی غلط فہمی سے ایک حکم جاری کر دیا، بعد میں حقیقت معلوم ہوئی تو حکم بدل دیا۔ کبھی اس لیے ہوتا ہے کہ جس وقت یہ حکم جاری کیا گیا اس وقت کے حالات کے مناسب تھا اور آگے آنے والے واقعات و حالات کا اندازہ نہ تھا، جب حالات بدلے تو حکم بھی بدلنا پڑا یہ دونوں صورتیں احکامِ خداوندی میں نہیں ہو سکتیں۔ ایک تیسری صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ حکم دینے والے کو اول ہی سے یہ بھی معلوم تھا کہ حالات بدلیں گے اور اس وقت یہ حکم مناسب نہیں ہوگا، دوسرا حکم دینا ہوگا، یہ جانتے ہوئے آج ایک حکم دے دیا اور جب اپنے علم کے مطابق حالات بدلے تو اپنی قراردادِ سابق کے مطابق حکم بھی بدل دیا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ مریض کے موجودہ حالات کو دیکھ کر حکیم یا ڈاکٹر ایک دوا تجویز کرتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ دو روز اِس دوا کے استعمال کرنے کے بعد مریض کا حال بدلے گا، اس وقت مجھے دوسری دوا تجویز کرنا ہوگی یہ سب کچھ جانتے ہوئے وہ پہلے دن ایک دوا تجویز کرتا ہے جو اس دن کے مناسب ہے دو دن کے بعد حالات بدلنے پر دوسری دوا تجویز کرتا ہے، ماہر حکیم ڈاکٹر یہ بھی کر سکتا ہے کہ پہلے ہی دن پورے علاج کا نظام لکھ کر دیدے کہ دو روز یہ دوا استعمال کرو پھر تین روز فلاں دوا پھر ایک ہفتہ فلاں دوا، لیکن یہ مریض کی طبیعت پر بے وجہ کا ایک بار بھی ڈالنا ہے، اس میں غلط فہمی کی وجہ سے

عملی خلل کا بھی خطرہ ہے، اس لیے وہ پہلے ہی سے سب تفصیلات نہیں
بتلاتا، اللہ جل شانہ کے احکام میں اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں میں
صرف یہی آخری صورت نسخ کی ہو سکتی ہے اور ہوتی رہی ہے، ہر آنے
والی نبوت اور ہر نازل ہونے والی کتاب نے پچھلی نبوت اور کتاب کے
بہت سے احکام منسوخ کر کے نئے احکام جاری کیے اور اسی طرح ایک ہی
نبوّت و شریعت میں ایسا ہوتا رہا کہ کچھ عرصہ تک ایک حکم جاری
رہا پھر بتقاضائے حکمتِ خداوندی اس کو بدل کر دوسرا حکم نامزد کر دیا گیا.
صحیح مسلم کی حدیث میں ہے "لَمْ تَكُنْ نُبُوَّةٌ قَطُّ إِلَّا تَنَاسَخَتْ" یعنی
کبھی کوئی نبوت نہیں آئی جس نے احکام میں نسخ اور ردّ و بدل نہ کیا ہو"۔ (۱)

حضرت مفتی صاحبؒ کی اس تحریر سے معلوم ہو رہا ہے کہ بتقاضائے حکمت احکامات کی تبدیلی نہ کوئی عیب ہے اور نہ ہی اس سے حاکم اعلیٰ کی طرف جہالت ونادانی کا انتساب لازم آتا ہے بلکہ یہ قانونِ فطرت کے عین مطابق ہے کیونکہ فطرت کا تقاضا ہے کہ مریض کا علاج اس کے حالات کے مطابق رفتہ رفتہ کیا جائے نہ کہ یکبارگی اُسے علاج بتلا کر فارغ کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ حکیم مطلق ہیں اور ان کی یہ کتاب نسخہ شفاء ہے، اس لیے ضروری تھا کہ انسانی مزاج اور حالات کے مطابق بتدریج احکام نازل کیے جاتے اور ان میں تبدیلی کی ضرورت پڑتی تو ضرور تبدیلی کی جاتی۔

ایک منکرِ حدیث سے گفتگو:

ایک دفعہ ناچیز کی ایک منکرِ حدیث صاحب سے جو قرآن میں نسخ کے وقوع کے منکر تھے، قرآن میں نسخ کے متعلق بات چیت ہوئی تھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اختصار کے ساتھ اسے ذکر کر دیا جائے، شاید اس سے کسی کو فائدہ ہو جائے۔

---

(۱) معارف القرآن۔ ج۱، ص ۲۸۴

منکرِ حدیث صاحب کہہ رہے تھے کہ قرآن کریم میں نسخ کا کہیں وقوع ہی نہیں ہے، میں نے کہا کہ یہ نظریہ تو خود قرآن کریم کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ قرآن میں فرمارہے ہیں مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا "ہم جو بھی آیت منسوخ کرتے ہیں یا اُسے بھلادیتے ہیں اس سے بہتر لے آتے ہیں"۔ وہ منکر صاحب بولے: یہاں آیت سے مراد سابقہ شریعت ہے، قرآن کی آیت نہیں، مطلب یہ ہے کہ ہم جو بھی سابقہ شریعت منسوخ کرتے ہیں اس سے بہتر لے آتے ہیں۔

ناچیز نے عرض کیا کہ آپ جو یہ دعویٰ فرمارہے ہیں کہ آیت سے مراد سابقہ شریعت ہے، اس دعوے کی کوئی دلیل پیش کریں ورنہ آپ کا یہ دعویٰ بلادلیل ہوگا جس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی وہ اس پر کوئی دلیل نہیں پیش کرسکے، سوائے اس کے کہ فلاں نے یہ بات لکھی ہے، میں نے عرض کیا کہ ہم فلاں کو کیا جانیں، اُن کی بات کوئی حجتِ شرعیہ نہیں ہے کہ اسے دلیل کے طور پر پیش کیا جاسکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ بات تبادر کے بھی خلاف ہے اس لیے کہ بات تو یہاں یہودیوں کے خلاف ہورہی ہے، یہودی نبی علیہ السلام اور قرآن کریم پر مختلف اعتراض کرتے تھے جن میں سے ایک اعتراض قرآن میں نسخ کے متعلق تھا کہ اگر یہ خدا کی کتاب ہے تو اس میں نسخ کا کیا مطلب، اِن کے اسی اعتراض کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی ہے، لہٰذا اِس آیت سے آیت قرآنی ہی مراد لی جائے گی نہ کہ سابقہ شریعت، تیسری بات یہ ہے کہ آپ کی یہ بات جمہور مفسرین کے خلاف ہے اس لیے ہم اس کو نہیں مانتے، پھر میں نے عرض کیا کہ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، میں جناب کو خود قرآن میں نسخ دکھلاتا ہوں، میں نے کہا کہ دیکھیے قرآن کریم میں ایک جگہ متوفیٰ عنھا زوجھا کی عدت ایک سال ذکر کی گئی ہے، چنانچہ ارشاد ہے وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ اس سے معلوم

ہورہا ہے کہ یہ عورت ایک سال عدت گزارے گی جبکہ دوسری جگہ متوفیٰ عنہا زوجہا کی عدت چار مہینے دس دن ذکر کی گئی ہے ،چنانچہ ارشاد ہے وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا اس آیت سے معلوم ہورہا ہے کہ یہ عورت چار مہینے دس دن عدت گزارے گی، بتایئے یہ پہلی آیت کا نسخ ہے یا نہیں؟۔وہ صاحب یہ سن کر پریشان سے ہوئے اور کہنے لگے میرے علم میں یہ بات نہیں ہے، میں تحقیق کروں گا۔میں نے کہا اسی پر کیا بس ہے اور سنیئے قرآن کریم میں ایک جگہ روزہ کی طاقت رکھنے والوں کو روزہ رکھنے کے بجائے فدیہ دے دینے کی اجازت دی گئی ہے،چنانچہ ارشاد ہے وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ جبکہ دوسری جگہ رمضان کا مہینہ پانے والے ہر شخص کو روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ان صاحب کا یہ باتیں سن کر پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور وہ ان کے جواب سے عاجز ہو کر چلے گئے۔

سورتوں کی تقسیم باعتبار ناسخ و منسوخ کے:

سورتیں باعتبار ناسخ و منسوخ کے چار قسم پر ہیں:

(۱) وہ سورتیں جن میں ناسخ و منسوخ دونوں ہیں، یہ پچیس سورتیں ہیں

(۱) بقرہ (۲) آل عمران (۳) نساء (۴) مائدۃ (۵) انفال (۶) توبہ (۷) ابراہیم (۸) مریم (۹) انبیاء (۱۰) حج (۱۱) نور (۱۲) فرقان (۱۳) شعراء (۱۴) احزاب (۱۵) سبأ (۱۶) مؤمن (۱۷) شوری (۱۸) ذاریات (۱۹) طور (۲۰) واقعہ (۲۱) مجادلہ (۲۲) مزمل (۲۳) مدثر (۲۴) تکویر (۲۵) العصر

(۲) وہ سورتیں جن میں فقط ناسخ ہے، یہ چھ سورتیں ہیں۔

(۱) فتح (۲) حشر (۳) منافقون (۴) تغابن (۵) طلاق (۶) اعلیٰ

(۳) وہ سورتیں جن میں فقط منسوخ ہے یہ چالیس سورتیں ہیں:

(۱) انعام (۲) اعراف (۳) یونس (۴) ھود (۵) رعد (۶) حجر (۷) نحل (۸) اسراء

(۹) کہف (۱۰) طٰہٰ (۱۱) مؤمنون (۱۲) نمل (۱۳) قصص (۱۴) عنکبوت (۱۵) روم

(۱۶) لقمان (۱۷) الم سجدہ (۱۸) فاطر (۱۹) صافات (۲۰) صٓ (۲۱) زمر (۲۲) حٰم سجدہ

(۲۳) زخرف (۲۴) دخان (۲۵) جاثیہ (۲۶) احقاف (۲۷) محمد (۲۸) قٓ (۲۹) نجم

(۳۰) قمر (۳۱) ممتحنہ (۳۲) القلم (۳۳) معارج (۳۴) قیامہ (۳۵) الانسان (۳۶) عبس

(۳۷) طارق (۳۸) غاشیہ (۳۹) والتین (۴۰) کافرون۔

(۴) وہ سورتیں جن میں نہ ناسخ ہے نہ منسوخ ہے، یہ کل ۴۳ سورتیں ہیں:

(۱) فاتحہ (۲) یوسف (۳) یٰسٓ (۴) حجرات (۵) رحمٰن (۶) حدید (۷) صفّ (۸) جمعہ

(۹) تحریم (۱۰) ملک (۱۱) الحاقۃ (۱۲) نوح (۱۳) جن (۱۴) مرسلات (۱۵) نبأ

(۱۶) نازعات (۱۷) انفطار (۱۸) مطففین (۱۹) انشقاق (۲۰) بروج (۲۱) فجر (۲۲) بلد

(۲۳) شمس (۲۴) لیل (۲۵) ضحیٰ (۲۶) الم نشرح (۲۷) علق (۲۸) قدر (۲۹) بیّنہ

(۳۰) زلزال (۳۱) عادیات (۳۲) قارعہ (۳۳) تکاثر (۳۴) ھمزہ (۳۵) فیل

(۳۶) قریش (۳۷) ماعون (۳۸) کوثر (۳۹) نصر (۴۰) تبت (۴۱) اخلاص (۴۲) فلق

(۴۳) ناس[1]

۲۵ + ۶ + ۴۰ + ۴۳ = ۱۱۴

سورتوں کی تقسیم باعتبار مثانی ومئین کے:

علماء و قراء نے قرآن پاک کی سورتوں کے چھوٹے بڑے ہونے کے اعتبار سے تین حصے کیے ہیں، چنانچہ شروع کا حصہ جس میں آٹھ سورتیں ہیں سورہ بقرہ سے لے کر سورۂ براءت تک۔ اِن کو سَبعِ طُوَل[2] کہا جاتا ہے۔ اِس کے بعد گیارہ سورتیں ایسی ہیں جو سو یا اِس سے

(۱) الاتقان في علوم القرآن۔ ج ۲، ص ۲۱۔۔۔۔ حاشية الجمل۔ ج ۱، ص ۴

(۲) باوجود آٹھ ہونے کے سَبعِ طُوَل اس لیے کہا جاتا ہے کہ اخیر کی دو سورتیں یعنی انفال اور براءت کا دو ہونا متیقن نہیں۔ طُوَل، طُولیٰ کی جمع ہے جیسے کُبَر، کُبریٰ کی جمع ہے۔

زائد آیات پر مشتمل ہیں، اِن کو ذَوَاتُ المِئِین کہا جاتا ہے، اِس کے بعد بیس سورتیں ایسی ہیں جن کی آیات سو سے کم ہیں، اِن کو مَثَانِی کہا جاتا ہے۔ اِس کے بعد پھر اخیر کی چھہتر سورتوں کو مُفَصَّل کہا جاتا ہے، پھر مفصل کی تین قسمیں کی جاتی ہیں، طِوال مفصل (سورہ حجرات سے لے کر سورہ بروج تک)۔ اوساطِ مفصل (سورہ طارق سے لے کر سورہ بیّنہ تک)۔ قِصار مفصل (سورہ زلزال سے لے کر ناس تک)۔

آیت:

امام کسائیؒ کہتے ہیں آیَۃٌ کی اصل آیِیَۃٌ ہے قَائِلَۃٌ کے وزن پر، تخفیفاً ہمزہ کو حذف کردیا تو آیَۃٌ ہوگیا، امام فرّاءؒ کا کہنا ہے کہ آیَۃٌ کی اصل أَیَّۃٌ (بتشدید الیاء) أَیِیَۃٌ بروزنِ ثَمَرَۃٌ ہے۔

آیت کے لغوی معنٰی:

آیت کے لغوی معنٰی علامت اور نشانی کے ہیں۔ بمعنی أنها علامة لانقطاع الكلام الذي قبلها من الذي بعدها وانفصاله[1] بایں معنٰی کہ یہ پہلے کلام کے بعد والے کلام سے جدا ہونے کی علامت ہوتی ہے۔

آیت کے اصطلاحی معنٰی:

آیت کی علماء نے مختلف تعریفیں کی ہیں، ایک مختصر اور آسان تعریف ذکر کی جاتی ہے۔ علامہ سیوطیؒ تحریر فرماتے ہیں بعض علماء کا کہنا ہے "الآية طائفة من القرآن منقطعة عما قبلها وما بعدها "[2]

"قرآن کریم کا وہ حصہ جو ماقبل ومابعد کلام سے ممتاز اور جدا ہوتا ہے وہ آیت ہے"۔

(۱) الجامع لأحكام القرآن۔ج۱، ص۶۹

(۲) الاتقان۔ج۱، ص۶۶

آیاتِ قرآنیہ کی تعداد:

قرآن پاک کی کل آیات کتنی ہیں اس میں اِس پر تو اتفاق ہے کہ چھ ہزار ہیں، مزید کتنی ہیں اس میں اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ ۲۰۴ ہیں، بعض نے کہا کہ ۲۱۴ ہیں، بعض نے کہا کہ ۲۱۹ ہیں، بعض کے نزدیک ۲۲۵ ہیں،
اہل کوفہ کے نزدیک ۲۳۶ ہیں، عام اور مشہور روایت یہ ہے کہ ۶۶۶ ہیں۔
علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں:

"قال الداني: أجمعوا على أن عدد آيات القرآن ستة آلاف آية ثم اختلفوا فيما زاد على ذلك فمنهم من لم يزد ومنهم من قال: ومائتا آية وأربع آيات وقيل وأربع عشرة وقيل وتسع عشرة وقيل وخمس وعشرون وقيل ست وثلاثون"(۱)

علامہ دانیؒ(۲) فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی آیات چھ ہزار ہیں، مزید کتنی ہیں اس میں اِختلاف ہے، بعض علماء تو اس سے زیادہ کے قائل ہی نہیں ہیں، بعض نے کہا کہ ۲۰۴ ہیں، بعض کا کہنا ہے کہ ۲۱۴ ہیں، بعض کے نزدیک ۲۱۹ ہیں، بعض کے نزدیک ۲۲۵ ہیں، بعض کے نزدیک ۲۳۶ ہیں۔

ایک اشکال کا جواب:

یہاں ایک اشکال پیش آتا ہے، ضروری ہے کہ اُسے ذکر کرکے اس کا جواب دے دیا جائے، اشکال یہ ہے کہ جب بقولِ راجح آیاتِ قرآنیہ کی تعداد توقیفی یعنی موقوف علی السّماع ہے تو پھر اِن کی تعداد میں اختلاف کیوں ہے؟۔ لامحالہ ہمیں ایک ہی شمار کو صحیح کہنا ہوگا اور باقی کو غلط اور جو اِس صحیح شمار کے علاوہ دوسرے عدد کا قائل ہوگا وہ مسلمان

(۱) الاتقان۔ ج ۱، ص ۶۷

(۲) عثمان بن سعید ابو عمرو الدانی۔ قراءت کے بہت بڑے امام تھے۔ آپ کی مشہور ترین تصانیف التيسير في القراءات السبع، المحكم في نقط المصاحف اور المقنع في رسم مصاحف الأمصار ہیں۔ آپ نے ۴۴۴ھ میں وفات پائی۔

بھی نہیں ٹھہرے گا، کیونکہ وہ قرآن کریم میں کمی بیشی کا قائل سمجھا جائے گا۔
جواب یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی میں جو اختلاف ہوا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ایک گروہ بعض آیاتِ قرآنی کو قرآن میں داخل مانتا ہے دوسرا گروہ ان کو قرآن میں داخل نہیں مانتا، بلکہ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جس گروہ کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جس جگہ وقف کرنا پایا گیا اس کو اُنہوں نے آیت شمار کیا اور جن کے نزدیک دونوں جگہوں میں وقف کرنا ثابت نہ ہوا بلکہ وصلاً ثابت ہوا انہوں نے دونوں آیتوں کو ایک سمجھا، اس طرح آیات کی تعداد میں اختلاف ہو گیا، مثال کے طور پر سورۂ فاتحہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ پر وقف کرنا بھی ثابت ہے اور وقف نہ کرنا بھی ثابت ہے، اب جن حضرات نے وقف سنا اُنہوں نے اِس کو مستقل آیت قرار دیا اور غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ کو مستقل آیت، اِس طرح اِنہوں نے بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ کے بعد سورہ فاتحہ کی سات آیتیں بتلائیں، اور جن حضرات نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام سے أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ پر وقف نہیں سنا انہوں نے صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے لے کر غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ تک کو ایک آیت قرار دیا۔ اس طرح اِن کے نزدیک بسم اللہ کے بعد سورۂ فاتحہ کی چھ آیتیں ہوئیں، اور چونکہ دونوں طرح پڑھنا اُمّت کو تواتر کے ساتھ پہونچا ہے اس لیے دونوں باتیں صحیح ہیں، یہ کہنا بھی کہ بسم اللہ کے بعد سورۂ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں اور یہ کہنا بھی کہ بسم اللہ کے بعد اِس کی چھ آیتیں ہیں۔ اس طرح قرآن کریم کی کسی آیت کا انکار بھی لازم نہیں آتا اور تعداد میں فرق بھی ثابت ہو جاتا ہے، اِسی قسم کا اختلاف دوسری سورتوں میں بھی واقع ہوا اور آیات کی مجموعی تعداد میں اختلاف منقول ہوتا چلا آیا۔

آیاتِ قرآنی کی ترتیب توقیفی ہے:

امام زرکشیؒ اور دیگر علماء نے اجماع نقل کیا ہے کہ آیاتِ قرآنی کی ترتیب توقیفی ہے، حکم

الٰہی سے ہوئی ہے، ہر آیت کے متعلق حضرت جبریل علیہ السلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتے تھے کہ اس آیت کو فلاں آیت کے ساتھ رکھو، امام احمدؒ نے حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے باسنادِ حسن نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جبریل نے مجھے حکم دیا ہے کہ اس آیت کو فلاں سورت میں رکھو، اسی طرح ترمذی، ابوداؤد، نسائی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا گیا ہے "كان اذانزل عليه شيئ دعا بعض من كان يكتب فيقول ضعوا هذه الايات في السورة التي يذكر فيها كذاوكذا" حضور علیہ السلام پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ کاتبینِ وحی میں سے کسی کو بلاتے اور فرماتے یہ آیت فلاں سورت جس میں ایسے ایسے مضامین بیان ہوئے ہیں اس میں رکھو۔

پارے:

قرآن کریم تیس اجزاء پر منقسم ہے، جنہیں تیس پارے کہاجاتا ہے عوام الناس پارے کو سپارہ کہتے ہیں، جن کی اصل سی پارہ ہے۔ سی کا معنیٰ تیس اور پارہ کا معنیٰ جزء اور ٹکڑا، کیونکہ ہرپارہ قرآن کا تیسواں جزء اور ٹکڑا بنتا ہے اس لیے ہر جزء کو سپارہ کہہ دیاجاتا ہے، قرآن کریم کی یہ تقسیم معنٰی کے لحاظ سے نہیں کی گئی بلکہ پڑھنے پڑھانے میں آسانی اور سہولت کے لیے اُسے تیس برابر حصوں میں تقسیم کردیاگیا۔

رکوع:

قرآن کریم میں کل ۵۴۰ رکوع ہیں، پاروں کی تقسیم معنٰی سے ہٹ کر کی گئی تھی، اس کے برخلاف رکوع کی تقسیم معنٰی کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ جہاں ایک سلسلۂ کلام ختم ہوا وہاں حاشیہ پر رکوع کی علامت "ع" لگادی گئی، قرآن کریم کی تقسیم سپاروں اور رکوع میں کس نے کی، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہاجاسکتا، قرینِ قیاس یہ ہے کہ یہ کام عوام کی سہولت کے لیے دورِ صحابہ کے بعد ہوا ہے۔

حرکات:

قرآنِ کریم میں زیریں زبریں کس نے لگائیں، اس بارے میں تین نام لیے جاتے ہیں (۱) اَبُو الاَسْوَد دُؤَلی (م:۶۹ھ)۔ (۲) یحییٰ بن یعمر (م: ۱۲۹ھ)۔ (۳) نصر بن عاصم اللیثی (م:۸۹ھ)۔ اِن تینوں میں زیادہ مشہور ابو الاسود دؤلی ہیں، اِن سے متعلق ایک واقعہ بھی مشہور ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ہی حرکات لگانے کی طرف سب سے پہلے توجہ کی تھی، وہ واقعہ یہ ہے کہ

"ابو الاسود نے سنا کہ ایک قاری قرآن کریم کی حسبِ ذیل آیت تلاوت کررہا ہے أَنَّ اللهَ بَرِيْءٌ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ (جس کا مطلب ہے کہ بیشک اللہ اور اللہ کے رسول مشرکین سے بری وبیزار ہیں) قاری نے اس آیت میں رَسُوْلُهٗ کولام کی زیر کے ساتھ رَسُوْلِهٖ پڑھا (جس کے معنٰی ہوتے ہیں کہ اللہ مشرکین اور اپنے رسول سے بری وبیزار ہیں) ابو الاسودؒ یہ سن کر بہت ناراض ہوئے اور کہا خدا کی ذات اس سے پاک ہے کہ وہ اپنے رسول سے بیزار ہو، پھر بصرہ کے والی زیاد کے پاس آئے اور کہا کہ میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کردی، زیاد نے ان سے قرآن پر علامات لگانے کی فرمائش کی تھی جس سے لوگ قرآن کو پہچان سکیں، مگر ابو الاسود جلد اس کی تعمیل نہ کرسکے تھے، جب یہ واقعہ پیش آیا تو آپ سخت پریشان ہوئے اور معاملہ بڑی نازک صورت اختیار کرگیا"۔ (۱)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو الاسود نے زیاد کے کہنے پر قرآن کریم پر زیر زبر لگائے۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ خلیفہ عبد الملک بن مروان کے کہنے سے لگائے۔ (۲) مشہور یہ ہے کہ حجاج بن یوسف کے کہنے سے لگائے، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) مناهل العرفان للزرقاني بحوالہ علوم القرآن مترجم، ص ۱۳۳

(۲) الاتقان۔ج ۲، ص ۱۷۱

رسم وضبط:

اس موقع پر ضرور معلوم ہو رہا ہے کہ قرآن کریم کے رسم وضبط کے بارے میں بھی کچھ معلومات درج کردی جائیں، کیونکہ آج کل دیگر اُمور میں اختلاف کی طرح رسمِ قرآنی اور ضبطِ قرآنی کو بھی متنازع بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جس کالازمی نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ لوگ قرآن کریم میں بھی اختلاف ہوتا دیکھ کر اس سے دور ہوجائیں اور اُس کے سمجھ نہ آنے والے رسم وضبط کی وجہ سے اُس کی تلاوت ہی سے محروم ہوجائیں اعاذنا اللہ منہ،

یادرکھیے "رسمِ قرآنی" سے مراد کتابتِ قرآن ہے یعنی قرآن کریم کی کتابت کس انداز اور کس طریقہ سے ہونی چاہیے، چنانچہ دکتور عبدالتواب تحریر فرماتے ہیں :

"اصطلاح میں رسم مصحف سے مراد وہ طریقہ ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کے کلمات اور حروف لکھنے کے لیے اختیار کیا" (۱)

"ضبط" سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم کیسے پڑھا جائے اور اس کے حروف کی ادائیگی کیسے ہو؟ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ "رسم" کا تعلق حروف سے ہوتا ہے اور "ضبط" کا تعلق حرکات (یعنی زیر، زبر، پیش) سے ہوتا ہے، مثال کے طور پر ایک لفظ ہے "منبه" اس لفظ میں ایک تو اس کی رسم ہے کہ اسے لکھنا کیسے ہے چنانچہ ہم نے میم، نون، باء، ہ کو ملا کر منبہ لکھ دیا، دوسرے اس کا ضبط ہے کہ اسے پڑھیں گے کیسے، اِس پر کیا حرکات آئیں گی چنانچہ ہم نے ضبط الاسماء کی کتابوں کی طرف رجوع کرکے معلوم کیا کہ اس کا ضبط اس طرح ہوگا کہ میم پر پیش، نون پر زبر اور باء پر زیر لگے گی اور اسے اِس طرح پڑھیں گے "مُنَبِّہ"۔

قرآن کریم میں آپ بہت سے مقامات پر دیکھیں گے کہ لفظِ مالک کہیں الف کے ساتھ

(۱) الضبط المصحفي ۔ نشأته و تطوره للدكتور عبد التواب ۔ صفحہ ۵۹

لکھا ہوا ہے، کہیں الف کے بجائے میم پر کھڑی زبر کے ساتھ مثلاً مٰلِکِ، اسی طرح لفظِ کافر کہیں الف کے ساتھ لکھا ہوا ہے اور کہیں کاف پر کھڑی زبر کے ساتھ مثلاً کٰفِر، اس کا تعلق رسم وضبط سے ہے، اگرچہ یہ ایک الگ بحث ہے کہ رسم میں یہ فرق کیوں ہے؟[1] قرآن کریم کی کتابت میں ہم رسم عثمانی کے پابند ہیں یعنی جس انداز سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم لکھوایا ہے ہم اسی انداز کے ساتھ قرآن کریم لکھنے کے پابند ہیں، ہمیں اس انداز سے انحراف کسی طرح بھی جائز نہیں، چنانچہ حضرت امام سیوطی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وقال أشهب: سئل مالك: هل يكتب المصحف علىٰ ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا إلا على الكتبة الأولىٰ. رواه الداني في المقنع ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة. وقال في موضع آخر: سئل مالك عن الحروف في القرآن مثل الواووالألف أترى أن يغير في المصحف إذا وجد فيه كذلك؟ قال: لا. قال أبو عمرو: يعني الواووالألف المزيدتين في الرسم المعدومتين في اللفظ نحو أُولُوْا، وقال الإمام أحمد: يحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واوٍأوياءٍ أوألفٍ أوغير ذلك. وقال البيهقي في شعب الإيمان: من يكتب مصحفاً فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذي كتبوا به تلك المصاحف ولا يخالفهم فيه ولا يغير مما كتبوه شيئاً، فإنهم كانوا أكثر علماً وأصدق قلباً ولساناً وأعظم أمانةً منا، فلا ينبغي أن نظن بأنفسنا استدراكاً عليهم[2].

(۱) یہ فرق اختلاف قراءات کی وجہ سے ہے کیونکہ قرآن کریم سات قراءتوں میں نازل ہوا ہے اس لیے اس کے رسم میں اس کا لحاظ کیا گیا کہ تمام قراءتیں اس میں سمو جائیں۔

(۲) الاتقان في علوم القرآن - ج ۲، ص ۱۶۷

امام اشہبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت امام مالکؒ سے دریافت کیا گیا کہ آیا مصحف (قرآن کریم) کو لوگوں کے بنائے ہوئے ہجا کے مطابق لکھ سکتے ہیں؟ فرمایا کہ نہیں بلکہ اس کو اسی پہلے سے چلے آنے والی کتابت کے انداز پر ہی لکھنا چاہیے، اس قول کو امام دانیؒ نے اپنی کتاب "المقنع في رسم مصاحف الأمصار" میں روایت کیا ہے، اور اس کو روایت کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اس قول کا علماءِ اُمت میں سے کوئی بھی مخالف نہیں پایا گیا، امام اشہبؒ ہی نے ایک دوسری جگہ یہ بیان کیا ہے کہ حضرت امام مالکؒ سے وَاؤ اور اَلِف کے مانند قرآن کریم کے حروف کے متعلق دریافت کیا گیا کہ آیا آپ کی یہ رائے ہے کہ اگر مصحف میں اس طرح پایا جائے تو اس کو بدل دیا جائے، آپ نے فرمایا کہ ہرگز نہیں، امام دانیؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا وَاؤ اور الف سے مراد وہ واؤ اور الف ہیں جو رسم الخط میں (یعنی لکھنے میں) زائد آتے ہیں اور پڑھنے میں اُن کا تلفظ نہیں ہوتا، مثلاً لفظِ اُولُوْا میں واقع شدہ واؤ اور الف، امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ واؤ یا الف وغیرہ کے بارے میں مصحف عثمانی کے رسم الخط کی مخالفت کرنا حرام ہے، امام بیہقیؒ نے اپنی کتاب "شعب الایمان" میں بیان فرمایا ہے کہ جو شخص مصحف کو لکھے اس کو چاہیے کہ وہ اُنہی حروفِ تہجی کی پابندی کرے جن سے صحابہ کرام علیہم الرضوان نے ان مصاحف کو لکھا ہے اور اس میں اُن سے اختلاف نہ کرے اور ان کی لکھی ہوئی چیز میں سے کسی شئی کو بدلے نہیں، اس لیے کہ وہ لوگ بہ نسبت ہمارے بہت زیادہ علم رکھتے تھے، اُن کے قلوب اور اُن کی زبانیں بہت ہی زیادہ صادق اور سچی تھیں، وہ امانت میں ہم سے بدرجہا بڑھے ہوئے تھے، اس لیے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ ہم اپنے آپ

کو ان کی کمی کو پورا کرنے والا سمجھیں

ان تصریحات سے واضح ہو رہا ہے کہ قرآن پاک کی کتابت میں رسم عثمانی کی پابندی ضروری ہے اور اس کی مخالفت کرنا جائز نہیں، رسم عثمانی کی حفاظت اور اس کی اہمیت کے پیش نظر اس سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن کا سلسلہ پہلی صدی ہجری ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ علامہ دانیؒ کی کتاب "المقنع" کی محققہ کی تحقیق کے مطابق رسم عثمانی سے متعلق سب سے پہلی کتاب یحیٰ ابن یعمر (م:۱۲۹ھ) نے تصنیف کی، رسم عثمانی سے متعلق لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے اہم اور جامع کتاب امام ابو عمرو الدانیؒ کی "المقنع في رسم مصاحف الأمصار" ہے، آپ کے بعد آپ کے شاگرد امام ابو داؤد سلیمان بن نجاحؒ (م:۴۹۶ھ) نے بھی بہت سی کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں سب سے مشہور و متداول کتاب "مختصر التبيين لهجاء التنزيل" ہے، علامہ دانیؒ اور آپ کے شاگرد ابن نجاحؒ کا کچھ کلمات کے رسم و ضبط میں اختلاف ہے جس کی بنیاد خود مصاحف عثمانیہ ہی ہیں، کیونکہ بعض مصاحفِ عثمانیہ میں کچھ کلمات جس انداز میں لکھے ہوئے ہیں دوسرے مصاحف میں وہ اس سے مختلف انداز میں لکھے ہوئے ہیں۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ مصاحفِ عثمانیہ میں اختلافِ رسم کی وجہ اُن علاقوں میں متعارف اندازِ کتابت تھا جہاں یہ مصاحف بھیجے گئے تھے، بہر حال استاذ اور شاگرد کے اِس اختلاف کی بناء پر رسم عثمانی کے بارے میں دو بڑے منہج قائم ہو گئے۔ (۱) منہجِ دانیؒ (۲) منہجِ ابن نجاحؒ، دونوں منہجوں کی بنیاد چونکہ مصاحفِ عثمانیہ ہی ہیں لہٰذا دونوں منہج صحیح ہیں، اِن میں سے کسی کو بھی غلط نہیں کہا جا سکتا، البتہ پاکستان، ہندوستان، افغانستان، بنگلہ دیش، لیبیا، آزاد وسطی ریاستیں اور اُن سے ملحقہ ممالک میں رہنے والے تقریباً ایک ارب مسلمان امام دانیؒ کے رسم کے مطابق کتابت شدہ قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں، جبکہ عرب ممالک میں عموماً ابن نجاحؒ کا رسم رائج ہے وہاں کے لوگ امام ابن نجاحؒ کے رسم کے مطابق کتابت شدہ قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں،

جو لوگ پاکستان میں رائج منہج دانیؒ کے رسم کو رسمِ عثمانی کے خلاف قرار دے کر عرب ممالک میں رائج منہج ابنِ نجاحؒ کو رائج کرنا چاہتے ہیں وہ بہت غلط قدم اُٹھا رہے ہیں، انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے، اوّلاً تو اس لیے کہ اس کی زد براہِ راست منہج امام دانیؒ پر پڑے گی اور اس کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گی کہ یہ منہج غلط ہے، حالانکہ یہ منہج بالکل صحیح و درست اور صدیوں سے رائج چلا آرہا ہے۔ ثانیاً اس لیے کہ اس طرح قرآن کریم کے رسم کے بارے میں اچھا خاصا اختلاف وانتشار پیدا ہو گا، کچھ اسے صحیح قرار دیں گے اور کچھ غلط، جس سے فائدہ ہونے کے بجائے اُلٹا نقصان ہی ہو گا۔ ثالثاً اِس لیے کہ بے شمار لوگ منہج ابنِ نجاحؒ سے واقف نہ ہونے کی بناء پر تلاوتِ قرآن کریم سے محروم ہو جائیں گے، کیونکہ لوگوں کے عجمی ہونے اور قواعدِ عربیہ سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے وہ منہج ابنِ نجاحؒ کے رسم کے مطابق صحیح طور پر تلاوت نہیں کر سکیں گے اور جو لوگ کوشش کر کے پڑھنے کی ہمت بھی کریں گے تو وہ بھی صحیح نہ پڑھ سکنے کی وجہ سے گنہگار ہوں گے،

دکتور الیاس فیصل اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"واضح رہے کہ رسم وضبط کا یہ منہج (منہج ابن نجاحؒ) عرب علاقوں میں متعارف ہے، برصغیر پاک وہند و دیگر عجمی ممالک میں رسم وضبط کا یہ منہج متعارف نہیں ہے، وہ اِس منہج کو اور خصوصاً اِس ضبط کو صحیح پڑھ بھی نہیں سکتے۔ بطور مثال اِس ضبط مشارقہ کی روسے اقْتَرَبَ، الْقَارِعَةُ، اقْتُلُوْا جیسے کلمات میں یکساں علامت وصل لگی ہوئی ہے، (ان پر زبر زیر پیش نہیں لگی ہوئی) جبکہ اقْتَرَبَ ہمزہ کی زیر سے، الْقَارِعَةُ ہمزہ کی زبر سے اور اقْتُلُوْا ہمزہ کے پیش کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، عرب لوگ اپنی عربی دانی کی بناء پر اِن تین مختلف الحرکات کلمات کو بالکل صحیح پڑھیں گے، جبکہ غیر عربی مسلمان اِن کلمات کو تب ہی صحیح پڑھ پائیں گے جب ہر کلمہ

کے ہمزہ پر اس کی مطلوبہ حرکت کو متعین کر کے لکھا جائے۔ اور ضبط کے رموز و اشارات چونکہ اجتہادی ہیں لہٰذا عجمی علاقوں میں شائع ہونے والے مصاحف میں ضبط کا ایسا منہج اپنایا گیا ہے جس میں ان کے لیے قرآن کریم کو صحیح پڑھنا ممکن ہو"(۱)

جو حضرات پاکستان میں بھی عرب ممالک میں رائج منہج کو ترویج دینا چاہتے ہیں اُن سے دردِ دل کے ساتھ گزارش ہے کہ وہ ایسا نہ کریں، جو منہج جہاں رائج ہے اُسے وہاں ہی رائج رہنے دیں، اِسی میں خیر اور اسی میں عافیت ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ پاکستان میں شائع ہونے والے مصحفِ تاج کو سعودی عرب کے "کنگ فہد قرآن کمپلیکس" میں اعلیٰ سطحی کمیٹی "مراقبة النص" نے منظور کر کے اِس کے شائع کرنے کی سفارش کی ہے اور یہ پاکستانی مصحف وہاں سے چھاپ کر پاک وہند وغیرہ کے حجاج کو چھبیس سال سے تقسیم کیا جارہا ہے، سوچنے کی بات یہ کہ جب سعودی عرب والے پاکستانی رسمُ الخط کے مطابق شائع ہونے والے مصحف کو صحیح قرار دے کر اُسے شائع کر رہے ہیں اور ہر سال پاک وہند وغیرہ کے حجاج میں تقسیم کر رہے ہیں تو پاکستانی حضرات کو کیا ہوا کہ وہ اِس کے رسم الخط کو غلط قرار دے کر ایک غیر معروف رسم کے مطابق قرآن شائع کرنے پر زور دے رہے ہیں؟ یَا لَلْعَجَبْ،



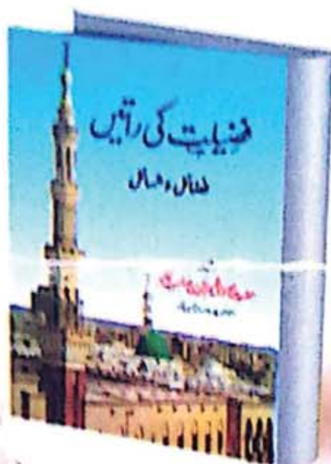
(۱) ماہنامہ الوار مدینہ، ش ۱۲، ج ۲۲، ص ۵۲

ماخذ و مراجع

القرآن العظیم	
الاتقان فی علوم القرآن	علامہ جلال الدین سیوطیؒ، سہیل اکیڈمی لاہور
البحر المحیط فی علم التفسیر	علامہ ابو حیّان اندلسی ظاہریؒ، بیروت
تفسیر القرآن العظیم (عربی)	حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ، دار المعرفۃ بیروت
تفسیر ابن کثیر (اردو)	طبع نور محمد، کراچی
تفسیر الجلالین	علامہ سیوطیؒ، علامہ محلیؒ، قدیمی کتب خانہ
الجامع لأحکام القرآن	ابو عبد اللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی مالکیؒ دار احیاء التراث، بیروت
الجامع الصحیح للامام البخاري	ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی کراچی
الجامع الصحیح للامام الترمذي	ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی کراچی
حاشیۃ الصاوي	شیخ احمد بن محمد الصاوی المالکیؒ، بیروت
روح المعاني تفسیر القرآن العظیم والسبع المثاني	سید محمد آلوسی حنفی بغدادیؒ مکتبہ امدادیہ ملتان
الضبط المصحفي، نشأته وتطوره	الدکتور عبد التواب مکتبۃ الآداب، القاهرة
علوم القرآن	مولانا محمد تقی عثمانی، مکتبہ دار العلوم کراچی

علوم القرآن (مترجم)	ڈاکٹر صبحی صالح ملک برادرز، کارخانہ بازار، فیصل آباد
الفتوحات الالهية بتوضيح تفسير الجلالين للدقائق الخفية المعروف بحاشية الجمل	شیخ سلیمان بن عمر عجیلی شافعیؒ المعروف بہ سلیمان الجمل طبع قدیمی کتب خانہ کراچی
فضائل قرآن	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ مکتبہ مدنیہ، لاہور
ماہنامہ انوارِ مدینہ	جامعہ مدنیہ (جدید) لاہور
مشكوة المصابيح	شیخ ولی الدین ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الخطیب التبریزی، ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی کراچی
معارف القرآن	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ ادارۃ المعارف کراچی
مفتاح السعادة	علامہ طاش کبریٰ زادہ حنفیؒ، بیروت
المنار (مع نور الانوار)	ابو البرکات عبد اللہ بن احمد نسفیؒ طبع ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی کراچی
يتيمة البيان لمشكلات القرآن	علامہ محمد یوسف بنوریؒ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

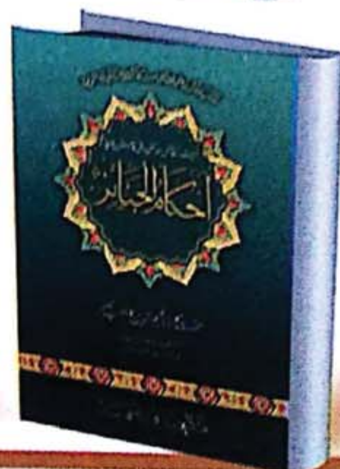






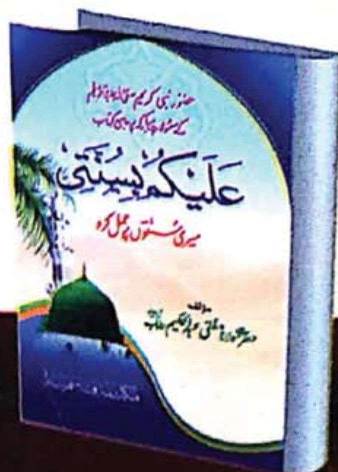












مکتبہ قاسمیہ
الفضل مارکیٹ ۱۷- اُردو بازار لاہور
Ph: 042-37232535-6, 0321-4220554
E.mail: maktaba_qasmia@hotmail.com